جلد سوم — بابت اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء — حصہ دوازدہم

اردو

انجمن ترقی اردو

کا

سہ ماہی رسالہ

فہرست مضامین

تنقید شعر العجم

از

جناب حافظ محمود صاحب شیرانی

و

پروفیسر ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی بیرسٹرایٹ لا

چوتھا دور

قولہ "اس عہد میں فارسی زبان کی ترقی کی ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ اب تک تمام اسلامی سلطنتوں کی علمی اور دفتری زبان عربی تھی، سلطان محمود اپنے ملکی اور فوجی خصوصیات کا بہت دلدادہ تھا، تاہم دفتری زبان اس کے عہد میں بھی عربی رہی۔ فرامین اور توقیعات تک اسی زبان میں لکھے جاتے تھے، لیکن الپ ارسلان سلجوقی جب تخت نشین ہوا تو اس نے حکم دیا کہ دفتر کی زبان فارسی کر دی جائے۔" (ص ۹۱ شعر العجم)

سلطان محمود کے دور میں ابتدائی دس گیارہ سال تک دفتر کی زبان فارسی تھی، کیونکہ سلطان کے وزیر اول ابوالعباس فضل بن احمد کو عربی کا علم نہ تھا اس لئے تمام تحریرات فارسی ہی میں تھیں ۴۰۱ھ سے ابوالقاسم احمد بن حسن میمندی وزیر ہوئے چونکہ وہ عربی داں تھے، اس لئے فارسی ترک کر دی گئی

اور عربی کا رواج ہوا۔ تاہم فارسی کا استعمال قطعاً متروک نہیں ہوا۔ اور ایسی حالتوں میں جب کہ مکتوب الیہ فارسی داں ہوتا تمام تحریرات فارسی ہی میں بھیجی جاتی تھیں۔

گزشتۂ بالا بیان میں نے تاریخ یمینی سے نقل کیا ہے، لیکن تاریخ بیہقی کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان مسعود کے زمانے میں، دربار غزنہ کی زبان فارسی ہی تھی، میرا مطلب یہ ہے کہ دربار میں عربی سے زیادہ فارسی کا رواج تھا۔ جب خلیفہ قادر باللہ وفات پاتا ہے، اور قائم بامر اللہ اس کا جانشین ہوتا ہے، بارگاہ خلافت سے ایک سفیر مع فرمان خلیفہ آتا ہے، یہ فرمان عربی میں تھا، چنانچہ اس کو اصل عربی میں سنائے جانے کے بعد سلطان مسعود کی خواہش پر اس کا فارسی ترجمہ سنایا جاتا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ غزنیں میں عربی کم سمجھی جاتی تھی۔ بیہقی کے الفاظ یہ ہیں:

"امیر خواجہ بونصر را آواز داد، پیش تخت شد، و نامہ لبتد، و باز پس آمد، و روے فرا تخت بایستاد، و خریطہ بکشاد، و نامہ بخواند، چوں بپایاں آمد، امیر گفت، ترجمہ اش بخواں، تا ہمگنان را مقرر گردد، و بخواند بپارسی، چناں کہ اقرار دادند شنوندگان کہ کسے را ایں کفایت نیست" (ص ۳۹۲)

اسی طرح سلطان مسعود اپنے بیعت نامہ کی جب دربار عام میں تصدیق کرتا ہے تو ابونصر مشکانی اصل عربی کو پڑھکر سناتا ہے لیکن اس کے فارسی ترجمہ کو خود سلطان مسعود پڑھکر حاضرین کو سناتا ہے چنانچہ:-

"امیر گفت، شنودم و جملہ آں مرا مقرر گشت، نسخۂ پارسی مرا دہ، بونصر بدو باز داد و امیر مسعود خواندن گرفت و از بادشاہانِ ایں خاندان رضی اللہ عنہم ندیدم کسے کہ پارسی چناں خواندے و نبشتے کہ وے نسخۂ عہد را تا آخر بر زبان راند، چناں کہ ہیچ قطع نہ کرد، و پس دوات خاصہ پیش آوردند، در زیر آں بخط خویش تازی و پارسی ہم زیر آنچہ از بغداد آوردہ بودند و ہم زیر آنچہ استادم ترجمہ کردہ بود نبشت"

بیعت نامہ کا اصلی عربی مسودہ اگرچہ بغداد سے طیار ہوکر آتا ہے، لیکن سلطان مسعود عہد بیعت کرتے وقت اس کے فارسی ترجمہ کو ترجیح دیتا ہے، چنانچہ فارسی عہد نامہ کو سر دربار پڑھکر سناتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دربار غزنہ میں فارسی ہی درباری زبان مانی جاتی تھی، علاوہ ازیں بیہقی میں اور

بیسیوں خطوط ہیں جو سلجوقیوں، غزنویوں اور طبرستانیوں کے درمیان آتے جاتے ہیں، لیکن یہ سب فارسی میں ہیں، جس سے بوثوق کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم مسعود کے دور میں فارسی زبان ہی درباری زبان تھی۔

قولہ "سنجر کی شاعرانہ مذاق اور قدر دانی کی داستانیں اکثر تذکروں میں مذکور ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کی قدر و قیمت اس کے دربار میں کیا تھی۔

ایک دفعہ ارکان دولت کے ساتھ، عید کا چاند دیکھنے نکلا، سب سے پہلے ہلال پر اسی کی نظر پڑی خوشی سے اچھل پڑا، سب کو انگلی کے اشارہ سے بتایا، ساتھ ہی حکم دیا کہ کوئی شاعر فی البدیہہ ہلال کی تعریف میں شعر سنائے۔ معزی اس وقت تک دربار میں اُمیدواری کرتا تھا، موقع پا کر اس نے برجستہ کہا:

اے ماہ چو ابروانِ یارے گوئی — یا ہیچو کمان شہریارے گوئی

نعلے زدہ از زر عیارے گوئی — در گوشِ سپہر گوشوارے گوئی

یعنی اے چاند تو ابروئے معشوق ہے یا بادشاہ کی کمان یا سونے کی نعل یا آسمان کے کان کا آویزہ۔

سنجر نے اسپ خاصہ اور پانچ ہزار درہم عطا کئے، معزی نے پھر برجستہ کہا:

چوں آتشِ خاطرِ مرا شاہ بدید — از خاک مرا بر زبر ماہ کشید

چوں آب یکے ترانہ از من بشنید — چوں باد یکے مرکب خاصم بخشید

سنجر نے ہزار دینار کے عطیہ کے ساتھ حکم دیا کہ شاہی لقب اس کے خطاب میں شامل کیا جائے۔ چونکہ سنجر کا لقب معزالدین بھی تھا، اس لئے معزی لقب ملا جو آج تخلص ہو کر مشہور رہے" شعرالعجم (صـ۱۱۰،۲۱)

حکایتِ بالا سلطان سنجر سے علاقہ نہیں رکھتی ہے بلکہ نظامی عروضی جو اس قصہ کا سب سے قدیم راوی ہے اور جو تمام قصہ خود امیر معزی کی زبان سے سنتا ہے، سنجر کے باپ ملک شاہ کی طرف منسوب

کرتا ہے، اس کے علاوہ نظامی کے اور مولانا کے بیانات میں اور بھی ضمنی اختلافات ہیں۔

ایک موقعے پر امیر معزی نظامی سے اپنی سرگزشت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرے باپ امیر الشعرا برہانی نے ابتداے عہد سلطنت سلطان ملک شاہ میں اپنی وفات کے وقت مجکو اس مشہور قطعے کے ذریعے سے جس کا ایک بیت یہ ہے۔

من رفتم و فرزند من آمد خلف الصدق　　او را بخدا و بخداوند سپردم

سلطان ملک شاہ کے سپرد کر دیا، اس کی وفات کے بعد اس کی تنخواہ اور جاگیر میرے نام کر دی گئی اور میں بادشاہی شاعر بن گیا۔ اگرچہ سال بھر برابر حاضر رہا، لیکن بادشاہ کا دیدار دور سے بھی مجکو میسر نہ آیا اور تنخواہ سے ایک دینار تک موصول نہیں ہوا، اور قرض برابر بڑھتا گیا۔ رمضان سے ایک یوم قبل میں شہزادہ علاء الدولہ امیر علی فرامرز کی خدمت میں حاضر ہوا، یہ شہزادہ شعر دوست ہونے کے علاوہ سلطان کا داماد اور ندیم خاص تھا، دربار میں اس کی بڑی عزت تھی اور میرے ساتھ مہربانی سے پیش آیا کرتا تھا۔ میں نے اس سے عرض کی کہ یہ بہت مشکل ہے کہ جو وصف باپ میں ہو بیٹے میں بھی ہو بات یہ ہے کہ امیر برہانی میرا باپ نہایت ہوشیار آدمی تھا، اور سلطان شہید الپ ارسلان فن شعر میں اس کا معتقد بھی تھا۔ میں شرمیلا اور خاموش طبیعت کا واقع ہوا ہوں، سال بھر خدمت گزاری کرتے گزری ہے، تنخواہ سے ایک حبہ وصول نہیں ہوا ہے اور مفت میں ہزار دینار کا قرضدار ہو گیا ہوں، آپ کی بڑی مہربانی ہو گی اگر سلطان سے اجازت دلوا دیں تاکہ نیشاپور چلا جاؤں اور اپنا قرض ادا کرنے کی کوئی سبیل نکالوں۔ امیر علی نے جواب میں کہا یہ ہمارا قصور ہے کہ اب تک تیری طرف سے غفلت برتی گئی۔ لیکن اطمینان رکھ کہ آیندہ ایسا نہیں ہوگا، آج مغرب کے وقت بادشاہ چاند دیکھنے نکلے گا، تو حاضر رہنا دیکھیں خدا کیا کرتا ہے۔ شہزادے کے حکم سے سو دینار نیشاپوری مجکو اسی وقت مل گئے، میں خوش خوش گھر آیا، اور رمضان کے بند و بست میں مصروف ہو گیا۔ عصر کے قریب سراپردۂ سلطانی پر آ کر حاضر ہو گیا، شہزادہ علاء الدولہ بھی اسی وقت آیا۔

میں اب نظامی کی اپنی عبارت نقل کرتا ہوں :

در آفتاب زرد سلطان از سراپرده بدر آمد، کمان گروههٔ زردست علاء الدوله بر راست من بدویدم و خدمت کردم، امیر علی نیکو بها پیوست و بماه دیدن مشغول شدند، و اول کسے که ماه دید سلطان بود، عظیم شادمانه شد علاء الدوله مرا گفت، پسر برهانی دریں ماه نو چیزے بگوے من بر فور ایں دوبیتے بگفتم:

اے ماه چو ابروان یاری گوئی یا نی چو کمانِ شہریاری گوئی

نعلے زده از زر عیاری گوئی در گوشِ سپہر گوشواری گوئی

چوں عرضه کردم، امیر علی بسیارے تحسین کرد، سلطان گفت برو از آخر ہر کدام اسپ که خواہی بکشائے، و دریں حالت برکنار آخر بودیم، امیر علی اسپے نامزد کرد، بیاوردند و بکسان من دادند، ارزیدے سی صد دینار نشاپوری، سلطان بمصلیٰ رفت و من در خدمت، نماز شام بگزاردیم و بخوان شدیم، برخوان امیر علی گفت پسر برهانی دریں تشریفے که خداوند جہاں فرمود ہیچ نگفتی حالی دوبیتے بگوے من برپاے جستم و خدمت کردم و چنانکه آمد حالے ایں دوبیتے بگفتم۔

چوں آتشِ خاطر مرا شاه بدید از خاک مرا برزبر ماه کشید

چوں آب یکے ترانه از من بشنید چو باد یکے مرکب خاصم بخشید

چوں ایں دوبیتے ادا کردم، علاء الدوله احسنتہا کرد و بسبب احسنت او سلطان مرا ہزار دینار فرمود علاء الدوله گفت جامگی و اجراش نرسیده است فردا بردامنِ خواجه خواہم نشست تا جامگیش از خزانه بفرماید و اجراش برسپاہان نویسد، گفت مگر تو کنی که دیگراں را ایں جست نیست و او را بلقب من باز خوانید و لقب سلطان معز الدنیا والدین بود، امیر علی مرا خواجه معزی خواند، سلطان گفت امیر معزی، آں بزرگِ بزرگ زاده چناں ساخت که دیگر روز نماز پیشیں ہزار دینار بخشیده، و ہزار و دویست دینار جامگی و برات نیز ہزار من غله بمن رسیده بود و چوں ماه رمضان بیروں شد مرا به مجلس خواند و با سلطان ندیم کرد

واقبال من روئے در ترقی نہاد و بعد ازاں پیوستہ تیمار من ہمی داشت و امروز ہر چہ دارم از عنایت آں بادشاہزادہ دارم" (چہارم مقالہ طبع لیدن ص ۴۳ و ۲۰۱)

قولہ "غزل گوئی کی ایجاد گو سعدی سے منسوب ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اس صنم کدہ کے آذر نظامی ہی ہیں" ص ۲۱۴)

تغزل میں نظامی کسی خاص امتیاز کے مستحق نہیں کیونکہ غزل کے پہلے باغبان شہید، رودکی اور دقیقی ہیں۔ غزنوی دور میں عنصری بلکہ خود سلطان محمود کو اس کی آبیاری میں مصروف دیکھا جاتا ہے حکیم سنائی زیادہ تر زہدیات اور کمتر تصوف کی مضامین کی اس میں اشاعت دیتے ہیں، مجاز کے پردے میں حقیقت کے اسرار کی ترجمانی ان سے شروع ہو جاتی ہے، انوری کے ہاں سوز و گداز اور تعشق محض ہے اور یہ عطار ہیں جو غزل کو میخانہ کا راستہ بتاتے ہیں، رندوں کے آغوش میں پرورش کرتے ہیں اور حقیقت و مجاز کی دو عملی میں اس کا نشیمن آباد کرتے ہیں، مولانا روم اور عراقی بادۂ تند کے ساغر پلا پلا کر اُسے مست سرمدی بنا دیتے ہیں، حقیقت و مجاز ایک دوسرے سے ایسے گھل مل جاتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے امتیاز کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نظامی نے غزل کی کوئی خدمت نہیں کی۔ لیکن سنائی، انوری اور خاقانی کے مقابلہ میں اُنھوں نے کوئی امتیازی رتبہ حاصل نہیں کیا، اس لئے اس میدان میں نظامی کسی خاص شکریہ کے مستحق نہیں ہیں۔

حکیم سنائی

دیوانۂ لائے خوار کے قصہ کے ذکر کے بعد جس کو بسبب کثرت شہرت قلم انداز کیا جاتا ہے علامہ شبلی فرماتے ہیں:

قولہ "حکیم سنائی پر یہ اثر ہوا کہ اسی وقت سب چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے اور یہ رتبہ حاصل کیا کہ یا تو بہرام شاہ کے دربار میں جبّہ سائی کرتے تھے یا بہرام شاہ نے اپنی بہن کو

ان کے عقد نکاح میں دینا چاہا اور انھوں نے انکار کیا، چنانچہ بہرام شاہ کو جواب میں لکھا:

من نہ مرد زن و زر و جاہم — بخدا اگر کنم و گر خواہم
گر تو تاجم دہی ز احسانم — بہ سرِ تو کہ تاج نستانم (شعر العجم ص ۲۱۷)

مجکو اس قصہ پر یقین لانے میں بہت کچھ تامل ہے، اس لئے کہ یہ اشعار حدیقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور حدیقہ حکیم سنائی نے ساٹھ سال کی عمر میں تصنیف کیا ہے چنانچہ **اشعار**

روزگارم حسود بیباکم — از دلِ شوخ جان غمناکم — گرد پشتم کمان و گام چو تیر — گرد رویم چو قیر و موے چو شیر
پاے بر بام آمد از شصت — لاجرم دست میزنم بر دست (حدیقہ ص ۵۹۶)

دیگر

عمر دادم بجملگی بر باد — بر من آمد ز شصت صد بیداد (ص ۵۹۸)

عمر کی زیادتی بجائے خود اہم مانع ہونے کے علاوہ جس موقعہ پر ان کا ایراد ہوا ہے وہاں متن میں کوئی ایسا ایما نہیں پایا جاتا جس سے یہ گمان کیا جائے کہ ان اشعار کا مخاطب سلطان بہرام شاہ غزنوی ہے۔ تنہا ان اشعار کی بنا پر نتیجۂ بالا قائم کرنا خالی از غرابت نہیں ہے۔ یہ اشعار "قناعت" کے عنوان کے ذیل میں آتے ہیں اور زیادہ تر ایسا پایا جاتا ہے کہ ان میں کسی خاص بادشاہ کی طرف خطاب نہیں ہے۔ انہی ابیات کے بعد یہ اشعار آتے ہیں۔

زاں کہ چوں طوقِ منت بکشم — لقمۂ خوانِ نعمتت بچشم — بنوم بہرِ طمع مدحت گوے — ایں نیابی ز من جز از من جوے
(حدیقہ ص ۶۱۱)

الغرض یہ اشعار اسی طرح چلے گئے ہیں اور ان سے کوئی صریحی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔ شاعر کا اصل مقصد قناعت کی تعلیم و تلقین ہے اور پادشاہی خدمت سے اعراض و اغماض وغیرہ وغیرہ

قولہ "حکیم ثنائی نے جب حدیقہ تصنیف کیا تو چونکہ اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو عام عقائد کے خلاف ہیں، اس لئے علما نے سخت مخالفت کی یہاں تک کہ بہرام شاہ تک شکایت پہنچی بہرام شاہ نے، دار الخلافۂ بغداد سے استفتا طلب کیا، وہاں کے علما نے لکھا کہ یہ مسائل

قابلِ اعتراض نہیں"۔ (شعر العجم ص ۲۱۵)

جہاں تک تذکروں سے معلوم ہے، بہرام شاہ نے دار الخلافہ سے استفتا طلب نہیں کیا ہے خود دولت شاہ جس سے غالباً مولانا نے یہ قصہ نقل کیا ہے کہتا ہے:

"چوں کتاب حدیقہ تمام کرد، علمائے ظاہر غزنین بر حکیم طعن کردند و اعتراض کردند و آں کتاب را بدار الاسلام بغداد فرستاد و بدار الخلافہ عرض کرد و از علمائے بغداد و ائمہ آں دیار بر صحت عقیدۂ خود فتویٰ حاصل کرد"

مخزن الغرائب میں لکھا ہے۔

"چوں کتاب حدیقہ را با تمام رسانید، بمطالعۂ علمائے ظاہر غزنین در آمد، زبانِ طعن براو دراز کردند و بہ کفر و الحاد منسوب نمودند، خواستند او را تشہیر کنند، او بعلمائے غزنین گفت کہ چرا مرا ملامت و سرزنش می کنید، گفتند تو در حدیقہ خلاف شرع گفتہ، گفت ایں کتاب حدیقہ را بعلمائے دار السلام بغداد عرض می دارم، اگر علمائے آنجا بر کفر من فتویٰ دہند ہرچہ سزائے ما باشد بما رسانید، پس حدیقہ را بدار الخلافہ بغداد فرستاد، و از علمائے بغداد و ائمۂ آنجا بر صحت عقیدۂ خود فتویٰ ساخت، علمائے و ائمۂ آنجا بر صحت عقیدہ و بہ ثبوت ایمان و مذہبش دستخط و مواہیر نمودند، از آں سرزنش و بلیّہ نجات یافت"

مزید ثبوت کی ضرورت کے وقت خود حکیم سنائی کا قول نقل کیا جا سکتا ہے، اس بارہ میں حدیقہ کے خاتمہ میں کافی اطلاع موجود ہے۔

سنائی امیر برہان الدین ابوالحسن بن ناصر الغزنوی الملقب بہ بریانگر کو خطاب کر کے کہتے ہیں۔

اے تو بر دینِ مصطفےٰ سالار — بر طریقِ برادراں کن کار
عہد دیرینہ را بیاد آور — از طریقِ برادری مگذر
دین حق را بحق توئی برہاں — مر مرا زیں عقیلہا برہاں
تو بہ بغداد شاد و من ناشاد — خود نگوئی و را رسم فریاد
سال و مہ ترسناک و اندہگیں — گشتہ محبوس تربت غزنیں

(ص ۱۵۹ نولکشور)

بدایونی نے غالباً اس شعر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ کتاب حدیقہ سنائی نے اپنے حبس کے ایام لیا

لکھی تھی، منتخب التواریخ میں بہرام شاہ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"و حدیقۃ الحقیقۃ شیخ بنام اوست کہ در ایام حبس فرمودہ و جہت حبس شیخ تعصب غزنویہ بودہ در وادی تسنن"۔ (ص ۱۲ طبع نولکشور)

مکن آخر برادری پیش آر ۔ وز میان این جفاہا بردار ۔ گرچہ ہستم اسیر ہر نااہل ۔ چشم دارم کہ کار گرد سہل

تا کے این انقباض و این دوری ۔ بسر من کہ تو نہ معذوری ۔ عہدہائے قدیم را یاد آر ۔ حق نان و نمک فرو مگذار"

اس کے بعد حدیقہ کے ذکر میں کہتے ہیں:

این کتابے کہ گفتہ ام در پند ۔ چون رخ حور دلبر و دلبند ۔ ہر چہ دانستہ ام ز نوع علوم ۔ کردہ ام جملہ خلق را معلوم

آنچہ نص ست و آنچہ اخبار ست ۔ وز مشائخ ہر آنچہ آثار ست ۔ اندرین نامہ جملگی جمع ست ۔ مجلس عقل را یکے شمع ست

ملکوت این سخن چو بر خوانند ۔ حرز و تعویذ خویشتن دانند ۔ یک سخن زین و عالمے دانش ۔ ہمچو قرآن پارسی دانش" ص ۵۲

اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہوئے گویا ہیں:

"جاہلان جملہ ناپسند کنند ۔ وز سر جہل ریشخند کنند ۔ وان کہ باشد سخن شناس و حکیم ۔ ہمچو قرآن ورا کند تعظیم

گر کند طعنہ اندرین نادان ۔ گو مکن نیست بہتر از قرآن ۔ ہر شان لفظ او بود ترفند ۔ تو برو شکر کن بر ایشان خند

نخورم غم گر آل بو سفیان ۔ بنوند از حدیث من شادان ۔ بندہ را مدح مصطفیٰ ست غذا ۔ جان من باد جانش را بفدا

آل او را بجان خریدارم ۔ وز بدی خواہ آل بیزارم ۔ گر بد ست این عقیدہ و مذہب ۔ ہم برین بد بدارم یا رب" ص ۵۳

اس کے بعد امیر بربانگر سے استفتا کرتے ہیں:

تو چہ گوئی بیار فتوی کن ۔ نیست اندر سخن مجال سخن ۔ گفتم این و برت فرستادم ۔ در گنج علوم بکشادم

گر ترا این سخن پسند آید ۔ جان من رستہ از گزند آید ۔ ور پسند تو ناید این گفتار ۔ خود ندیدی بجملہ باد انکار

این سخن را مطابقت فرمائے ۔ نیک و بد در جواب باز نمائے ۔ ندہم بیش ازین ترا تصدیع ۔ عرض کن بر ہمہ شریف و وضیع

گوئی این اعتقاد مجد ودست ۔ جملہ بر گفتش آنچہ مقصودست ص ۵۴

حکیم سنائی ایک معلم کے فرزند تھے، جیسا کہ حدیقۃ الحقائق کے دیباچہ میں ارشاد کرتے ہیں، حدیقہ آپ نے خواجہ رئیس احمد بن مسعود بستہ کی فرمائش سے لکھا ہے۔

لیکن کنوں زلبس کرمش زیرتیشہ ام ۔۔۔۔ خواجہ رئیس احمد مسعود بیشہ را

اس کتاب کی تصنیف کے زمانے میں خواجہ احمد ہی ان کی جملہ ضروریات کے متکفل تھے، سنائی اس کی تصنیف پر قریباً دس سال یعنی ۵۲۴ھ سے ۵۳۵ھ تک مصروف رہے ؎

پانصدو بست و چار رفتہ زعام ۔۔۔۔ پانصدو سی و پنج گشتہ تمام

بعض نسخوں میں آخری مصرع یوں آتا ہے ع

پانصد و بست و پنج گشتہ تمام

حدیقہ میں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اشعار الحاقی بھی ہیں، مثلاً جنگ جمل کے واقعات کے ذکر میں شاعر نے تمام معتبر تاریخوں سے اختلاف کیا ہے۔ جنگ جمل (۳۶ھ) میں حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ ایک فریق تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک فریق۔

حدیقہ میں حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہ کو ایک فریق قرار دیا ہے اور کہا گیا ہے کہ حضرت معاویہ اس جنگ میں فرار ہوتے ہیں اور بغداد کی طرف چلے جاتے ہیں ؎

درجمل چوں معاویہ بگریخت ۔۔۔۔ خونِ ناحق بسے بخیرہ برخیت ۔۔۔۔ شد ہزیمت بجانب بغداد ۔۔۔۔ گشتہ از فعل زشت خود ناشاد

صفحہ ۲۸۰

جب حضرت عائشہؓ کے اونٹ کی کوچیں کاٹ دی جاتی ہیں اور ہودج گرتا ہے، ام المومنین امان مانگتی ہیں حضرت علی، حضرت محمد بن حضرت ابوبکرؓ کو بلواتے ہیں اور محمدؐ آکر چاہتے ہیں کہ بہن کا سر کاٹ لیں، لیکن حضرت علی منع کرتے ہیں۔

بل آں ستیزہ راپے کرد ۔۔۔۔ برگ و ساز معاویہ نے کرد ۔۔۔۔ ہودج زن بخاک تیرہ فتاد ۔۔۔۔ وز خجالت نقابِ رخ نکشاد

منت بد کردہ ام امانم دہ ۔۔۔۔ وز ترحم کنوں زمانم دہ ۔۔۔۔ چوں بدیدند زود برگشتند ۔۔۔۔ درخوی و خون ورا نباغشتند

اند حیدر برادرش رازود ۔۔۔۔ جملہ احوالہا ورا بنمود ۔۔۔۔ رفت وقتے محمدِ بو بکر ۔۔۔۔ آں ہمہ صدق و فارغ از ہمہ مکر

ں برآہیخت تیغ تا بزند ۔۔۔۔ گفت حیدر مکن کس ایں نکند ۔۔۔۔ عفو کن تا بسوئے خانہ رود ۔۔۔۔ بعد ازیں کارہائے بد نکند

(صفحہ ۲۸۰)

حضرت محمد پھر اپنی بہن کو مکہ معظمہ کی طرف بھجواتے ہیں آپ جب مکہ پہنچ جاتی ہیں، کچھ عرصہ بعد حضرت معاویہ

آپ کو قتل کر دیتے ہیں ؎

بر گرفتش محمد از سرِ راہ | جملہ لشکر شدہ ز کار آگاہ
سوئے مکہ زود بفرستاد | در تواضع محل رو نہاد
باہزاران خجالت و تشویر | رفت زی مکہ جفت گرم و زحیر
عاقبت ہم بدست آں باغی | شد شہید و بکشت آں طاغی
آں کہ باجفت مصطفٰے زینساں | بد کند مرد را مبر د مخواں

(ص ۲۸۱)

شاعری کی ایک اور اہم خدمت، جو سنائی نے کی ہے، تغزل ہے۔ سنائی کے عہد سے پیشتر غزل کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ لیکن اس صنفِ سخن نے ان کے ہاں مستقل شان پیدا کر لی ہے۔ بلحاظ زبان ان کی غزل، قطعہ، اور قصیدہ میں، متقدمین کی طرح کوئی تفاوت نہیں دیکھا جاتا ہے۔ تخلص کا رواج، غزل کے مقطع میں سب سے پیشتر انھی کے ہاں پایا جاتا ہے۔ واردات حقیقت کو مجاز کی زبان میں ادا کرنا انھی سے شروع ہوتا ہے، اگرچہ مذاق میں زہدیات غالب ہے تاہم تغزل کو خرابات کا راستہ بتانے والے حکیم سنائی ہیں۔ عرفان اور رندی کی آمیزش کے قدیم ترین نمونے انھی کے کلام میں ملتے ہیں۔ عطار اور مولانا روم انھی کی بنیادوں پر قصر و ایوان تعمیر کرتے ہیں۔ قصہ مختصر سنائی کے ہاں شاعری بلحاظ غزل ایک نئی کروٹ لیتی ہے۔ زہد خشک کا خاتمہ ہوتا ہے اور رندی اور مستی کی داغ بیل ڈال دی جاتی ہے، صومعہ چھوڑا جاتا ہے۔ میخانہ آباد کیا جاتا ہے۔ زاہد سے اعتزال ہوتا ہے، اور خرابات نشینی اختیار کی جاتی ہے۔ امثال

در دل آں را کہ روشنائی نیست | در خراباتش آشنائی نیست
پسرا خیز و جام بادہ بیار | کہ مرا برگِ پارسائی نیست
جرعۂ مے بجان و دل بخرم | پیش کس مے بدیں روائی نیست

دیگر

اے ساقی، مے بیار پیوست | کاں یار عزیز توبہ بشکست
برخاست زجائے زہد و دعویٰ | در میکدہ با نگار بہ نشست
بنہاد ز سر ریا و طامات | از صومعہ ناگہاں برو جست
بنہاد ز پائے، بند تکلیف | زنار مغانہ برمیاں بست

مے خورد و مرا بگفت، مے خور　　تا بتوانی مباش جز مست

اندر رہِ نیستی ہمی رو　　آتش در زن بہر چہ و ہے ہست

میرزا محمد حواشی چہار مقالہ (ص ۱۵۱) میں لکھتے ہیں کہ ان کی وفات باصح اقوال ۵۴۵ھ میں ہوئی ہے۔

امیر معزی المتوفی ۵۴۲ھ کے مرثیہ میں سنائی نے یہ اشعار لکھے ہیں:

تا چند معزاے معزی کہ خدایش　　زیں جا بفلک برد و قباے ملکی داد

چوں تیرِ فلک بود قرینش سرہ آورد　　پیکاں ملک برد و بہ تیرِ فلکی داد

بہرام شاہ غزنوی کے علاوہ انھوں نے سلطان سنجر کی بھی مداحی کی ہے، ایک قصیدہ جس کا مطلع ہے ؎

خاک را از باد بوئے مہربانی آمدہ است　　دردہ آں آتش کہ آبِ زندگانی آمدہ است

سنجر کے ابتدائی تخت نشینی کے ایام میں لکھا گیا ہے، جیسا کہ فرماتے ہیں ؎

چوں بسلطانی نشستی تہنیت گویم ترا　　اے کہ اسلافِ ترا سلطاں نشانی آمدہ است

خواجہ احمد معروف بہ عارفِ زرگر اور قاضی فضل بن یحییٰ بن صاعد اور علی بن معصیم ہروی کے ساتھ سنائی نے قصائد تبدیل کئے ہیں۔ شیخ الاسلام جمال الدین ابوالمفاخر، محمد بن منصور سرخسی مفتی مشرق کی تعریف میں سنائی نے ایک سے زیادہ ترکیب بند لکھے ہیں اور بقول پروفیسر سر محمد اقبال ام اے۔ پی ایچ ڈی مثنوی سیر العباد الی المعاد بھی انھی محمد بن منصور کے نام لکھی ہے۔ (حواشی راحت الصدور ص ۴۷۴ طبع یورپ)

عمر خیّام

از

پروفیسر شیخ سر محمد اقبال ام اے، پی ایچ ڈی

پنجاب یونیورسٹی نے مشرقی علوم و فنون کی سرپرستی کے لئے جو صحیح راستہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ عربی، فارسی، اور سنسکرت کی تعلیم کے لئے یورپی ڈگریوں والے اصحاب کو یونیورسٹی پروفیسر مقرر کیا ہے۔ ان اصحاب میں عربی کا صیغہ پروفیسر محمد شفیع ام اے کی ذات گرامی سے

سے مشرف ہے اور فارسی صیغہ پروفیسر محمد اقبال ام اے، پی ایچ ڈی سے تعلق رکھتا ہے۔

پروفیسر اقبال گزشتہ سال کیمبرج سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لے کر تشریف لائے ہیں۔ آپ نے فارسی زبان میں سلجوقیوں کی سب سے قدیم تاریخ المسمیٰ بہ راحت الصدور و آیۃ السرور، تالیف محمد بن علی بن سلیمان الراوندی کو جو ۵۹۹ھ میں تصنیف ہوئی ہے، نہایت قابلیت اور محنت کے ساتھ شائع کیا ہے اور علمی تحقیقات و تلاش کی پوری پوری داد دی ہے۔

میری درخواست پر آپ نے عمر خیام کے متعلق، مولانا شبلی کے تصنیف پر یہ چند انتقادیہ خیالات ظاہر کئے ہیں۔

محمود شیرانی

اسلامی دنیا کے تمام گزشتہ شاعروں اور ادیبوں میں خیام کی ہستی بالکل یکتا ہے۔ ایران کے اس شاعر فیلسوف کو جو شہرت آج حاصل ہے اور جتنا لٹریچر اس کی شخصیت، اس کے ذاتی حالات، اس کے مذہبی، اخلاقی اور فلسفی خیالات پر گزشتہ پچاس سال کے عرصے میں یورپ کی مختلف زبانوں میں لکھا جا چکا ہے اس کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب خانہ بن سکتا ہے۔

لیکن یہ جو کچھ اب تک ہوا ہے سب اہل مغرب کی تحقیق اور کاوش کا نتیجہ ہے۔ مسلمان بلکہ خود اہل ایران جن کے لئے خیام کے کمالات مایۂ ناز ہو سکتے تھے شروع ہی سے اس کی شخصیت کی طرف سے بے اعتنائی کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔ فارسی یا عربی تذکرہ نویسوں نے مستقل طور سے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا، مورخوں نے اس کو بالکل پس پشت ڈالا، اس کی رباعیات کا کوئی ایسا نسخہ جس پر ذرا سا بھی اعتبار کیا جا سکے محفوظ نہیں رکھا گیا اور سخت افسوس کا مقام ہے کہ اب بھی جب کہ یورپ خیام کو ہم سے روشناس کرا چکا ہے اور اس کی خوبیوں کو تمام و کمال ہمارے ذہن نشین کر چکا ہے، ہماری بے توجہی بدستور چلی جا رہی ہے۔ ہر چند یہ ہمارے لئے شرم کی بات ہے کہ ہماری اپنی زبان اور اپنے ملک کی ادبیات کی تنقید میں اجنبی لوگ ہمارے مذاق کی رہنمائی کریں لیکن اس سے

بھی بڑھکر شرمناک امر یہ ہے کہ ہم ان کی رہنمائی کے ممنون نہ ہوں اور اس سے فائدہ نہ اُٹھائیں۔ اپنی ذاتی تحقیق کا قدم آگے بڑھانا اور اپنے پیشرو محققوں کی غلطیوں کی تصحیح کرنا یا ان کے ذخیرۂ انکشافات میں اضافہ کرنا ہر صاحب تصنیف کا فرض ہے لیکن اگر وہ ایسا نہ کرسکے تو اس درجہ قابل الزام نہیں جتنا کہ یہ امر قابل اعتراض ہے کہ اُن معلومات کو جو پہلے سے مہیا کی جاچکی ہوں نظرانداز کیا جائے۔

یہی وہ اعتراض ہے جس کے مورد مولانا شبلی اپنی مشہور کتاب شعرالعجم میں خیام کے حالات لکھنے میں ہوئے ہیں۔ مولانا شبلی اُردو ادیبوں میں واحد شخص ہیں جنھوں نے اسلام کی تاریخ اور خصوصاً عجم کی شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ اُن کے فضل وکمال سے ہم کو توقع تھی کہ خیام جیسے بے نظیر صاحب کمال کے بارے میں جس کی شخصیت کے متعلق علمی دنیا اس قدر گہری دلچسپی کا اظہار کررہی ہے، ہماری معلومات میں اضافہ کرینگے اور اپنی فاضلانہ تنقید سے اُن شکوک کو رفع کرینگے اور اُن غلط روایتوں کی تردید کرینگے جو خیام پرستوں کے اعتقادات میں شامل ہیں۔ لیکن شعرالعجم کو دیکھنے سے ہمیں مایوسی ہوتی ہے کہ جو تفاصیل خیام کے حالات میں ہم کو اس میں ملتی ہیں وہ اس کی رباعیات کے ہر معمولی دیباچہ نویس نے لکھی ہیں بلکہ کچھ زیادہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

خیام کے حالات میں سب سے پہلے مولانا شبلی نے وہ مشہور قصہ لکھا ہے جس میں بیان کیا جاتا ہے کہ حسن بن صباح نظام الملک وزیر اور خیام تینوں ایک ہی مکتب میں ہم سبق تھے اور انھوں نے زمانہ طالب علمی میں عہد کیا تھا کہ ہم میں سے جو ترقی پاکر کسی بڑے منصب پر پہونچے وہ اپنے ساتھیوں کی دستگیری کرے۔ مولانا نے محض ایک مقبول عام روایت کو مختصر طور سے لکھ دینے پر قناعت کی۔ حالانکہ یہ قصہ معاً اس قدر عجیب اور اس درجہ مورد شکوک ہے کہ ایک علمی تصنیف میں اس پر بہت لمبی چوڑی تنقید ہونی چاہیئے۔

یہ قصہ تاریخ اور تذکرہ کی متعدد کتابوں میں منقول ہے مثلاً تاریخ گزیدہ، روضۃ الصفا، حبیب السیر اور تذکرہ دولت شاہ سمرقندی وغیرہ میں۔ لیکن قدامت کے اعتبار سے سب سے پہلے اس کو صاحب جامع التواریخ نے (جو آٹھویں صدی ہجری کے شروع میں تصنیف ہوئی) لکھا ہے۔ اگرچہ جامع التواریخ ایک مستند کتاب ہے اور اس کے مصنف کی ثقاہت مسلمہ ہے تاہم یہ قصہ ایسا سیدھا سادہ نہیں ہے کہ ہم اس کو محض ایک

مصنف کی ثقاہت کی وجہ سے قبول کرلیں۔ اس کے متعلق یورپ کے تمام مشہور فضلا نے جو فارسی زبان کے ماہر ہیں تنقید کے طور پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے لیکن سب سے زیادہ قابل وقعت وہ تنقید ہے جو چہار مقالہ نظامی عروضی کے شارح مرزا محمد قزوینی نے کتاب مذکور کے حاشیوں میں لکھی ہے۔ چونکہ مرزا صاحب علاوہ عالم و ماہر ہونے کے اہل زبان اور خیام کے ہم وطن ہونے کا فخر بھی رکھتے ہیں اس لئے ان کی رائے اس بارے میں ہر طرح قابل اعتماد ہے۔ ہم ان کی عبارت کا ملخص یہاں درج کرتے ہیں :۔

"رشید الدین فضل اللہ صاحب جامع التواریخ نے جو کہ ۷۱۸ھ میں مقتول ہوا اپنی کتاب میں عمر خیام، حسن بن صباح اور نظام الملک کی رفاقت اور ہم مکتبی کے زمانے میں عہد وفا باندھنے کی حکایت بیان کی ہے۔ یہ حکایت رشید الدین کے اپنے بیان کے مطابق اس نے کتاب "سرگزشت سیدنا" سے اخذ کی ہے جو کہ حسن بن صباح کے حالات میں لکھی گئی تھی اور جو اسماعیلی فرقے کے مشہور قلعہ الموت کے کتاب خانے میں تھی۔ ہلاکو خاں تاتاری نے جب اس قلعے کو سر کیا تو علاء الدین عطا ملک جوینی صاحب تاریخ جہانکشا کو مامور کیا کہ وہ قلعے کے اندر جاکر کتاب خانے کا ملاحظہ کرے اور جس کتاب کو وہ اپنی دانست میں محفوظ رکھنے کے قابل سمجھے، رکھے باقی کو جلا دے من جملہ ان کتابوں کے جو علاء الدین نے محفوظ کرلیں یہ کتاب بھی تھی۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ خود علاء الدین نے جس نے کہ اپنی کتاب تاریخ جہانگشا کا ایک مستقل حصہ اسماعیلیوں اور قلعہ الموت کی تاریخ میں لکھا ہے، اس کتاب کا کہیں ذکر نہیں کیا۔

تینوں ہم سبقوں کے عہد کرنے کی یہ داستان یورپ کے اکثر علما کے نزدیک جعلی ہے۔ نظام الملک کی تاریخ ولادت باتفاق مورخین ۴۰۸ھ ہے اور تاریخ وفات ۴۸۵ھ، عمر خیام اور حسن صباح کی پیدائش تو معلوم نہیں۔ لیکن ان کی وفات کی تاریخ ۵۱۷ھ اور ۵۱۸ھ ہے۔ پس اگر خیام اور حسن نظام الملک کے ہم سن یا متقارب السن تھے جیسا کہ اس حکایت کا مقتضا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ ان دونوں کی مدتِ عمر سو سو سال سے بھی زیادہ ہوئی اور گو یہ عادۃً محال نہیں تاہم مستبعد ضرور ہے۔ پھر اگر ان دونوں میں سے ایک کی عمر اس قدر بڑی ہوئی ہوتی تو چنداں بعید الوقوع بات نہ تھی تعجب اس بات پر ہے کہ دونوں کے دونوں نے معاً اس قدر خوارق العادت عمریں پائیں اور پھر ایک ساتھ مرے۔ علاوہ اس کے کہیں کسی کتاب میں بھی تصریحاً یا اشارۃً

ان دو نامور اشخاص میں سے کسی ایک کا غیر معمولی عمر تک پہنچنا ثابت نہیں ہوتا"۔[۵۱]

نظامی عروضی مصنف چہار مقالہ جو خود خیام کا معاصر تھا اور جس کو متعدد دفعہ اس سے ملاقات کرنے کا موقع ملا ہے۔ خیام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ۵۰۸ھ میں بادشاہ وقت نے خیام کو پیغام بھجوایا کہ ہم شکار کو جانا چاہتے ہیں تم اپنی نجوم دانی کے ذریعے سے کوئی ایسی تاریخ مقرر کرو کہ جو برف باری سے محفوظ ہو۔ چنانچہ اس نے حساب لگا کر ایک تاریخ تجویز کردی۔ سردی کا موسم تھا ابھی تھوڑی دور نکلے ہونگے کہ بڑے زور کا بادل اٹھا اور سرد ہوا چلنے لگی۔ خیام ساتھ تھا بادشاہ نے اس کو سخت زجر و توبیخ کی۔ اس نے کہا کہ آپ ذرا صبر کریں۔ ابھی مطلع صاف ہوا جاتا ہے اور پانچ دن تک بادل دکھائی بھی نہ دے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اس حکایت کو خود مولانا شبلی نے شعر العجم میں نقل کیا ہے[۵۲]۔ اگر ہم خیام کو نظام الملک کا ہم سن مانیں تو ۵۰۸ھ میں اس کی عمر سو برس کی ہونی چاہیئے۔ اب خیال کرنا چاہیئے کہ ایک سو برس کے بڈھے پھوس کے لئے اعمال نجوم کے ذریعے سے پیشین گوئیاں کرنا اور پھر جاڑے اور برف باری کے عالم میں بادشاہ کی ہمراہی میں شکار کو نکلنا کہاں تک قرین قیاس ہے؟

اگر یہ مانا جائے کہ نظام الملک اپنے دوسرے ہم مکتبوں سے عمر میں بڑا تھا تو ہم کو اس کی عمر کی بڑائی کم از کم بقدر تیس برس کے ماننی ہوگی۔ اگر خیام اور حسن صباح نے اسّی اسّی پچاسی پچاسی برس کی بھی عمر پائی تو ظاہر ہے کہ ان کی ولادت ۴۳۵ھ کے قریب قریب ہونی چاہیئے۔ اس صورت میں نظام الملک ان دونوں سے قریباً ستائیس برس بڑا ٹھہرا تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک چالیس برس کا سن رسیدہ آدمی بارہ بارہ تیرہ تیرہ برس کے بچوں کا ہم سبق ہو جب کہ دوسری طرف ہم کو معلوم ہے کہ نظام الملک نے نوجوانی ہی میں ابوعلی شاذان گورنر بلخ کے ہاں بحیثیت کاتب کے ملازمت اختیار کرلی تھی۔[۵۳]

۵۱؎ چہار مقالہ طبع یورپ صفحات ۲۱۶ و ۲۱۷،

۵۲؎ دیکھو کتاب مذکور جلد ۱ صفحہ ۲۳۰،

۵۳؎ دیکھو تاریخ ابن خلکان ترجمہ نظام الملک،

اگرچہ یورپ میں کتاب چہار مقالہ شعرالعجم کے بعد شائع ہوئی لیکن اوپر کی عبارت میں جو مطالب بیان کئے گئے ہیں ان میں سے اکثر پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب "تاریخ ادبیات ایران" کی دوسری جلد (صفحہ ۹۰-۱۹۲) میں درج کئے ہیں اور پھر قریب قریب انھیں مطالب کو وِن فیلڈ صاحب نے دیباچہ رباعیات عمر خیام (طبع لندن ۱۹۰۱ء) میں تحریر کیا ہے۔ رباعیات کے اس اڈیشن کا ذکر خود مولانا نے کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب مذکور سے بخوبی واقف تھے۔ مولانا اگر انگریزی سے نابلد تھے تو کم از کم فرانسیسی اچھی طرح جانتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں میں متعدد دفعہ اس کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر ہوتسمانے عماد الدین الکاتب الاصفہانی کی مشہور تاریخ زبدۃ النصرۃ (طبع لیدن ۱۸۸۹ء) کے فرانسیسی دیباچے میں قریب قریب یہی باتیں دہرائی ہیں[1] اور ساتھ ہی ایک دل چسپ حقیقت کو منکشف کیا ہے جو قابل تسلیم ہے۔ وہ یہ کہ دراصل خیام اور حسن بن صباح کا ہم مکتب نظام الملک نہ تھا بلکہ انوشیروان بن خالد تھا جو کہ منصب وزارت میں نظام الملک کے جانشینوں میں سے تھا۔ چنانچہ خود انوشیروان نے واضح طور سے اس کو لکھا ہے[2]۔

عموماً تاریخی روایتوں میں اور خصوصاً ایران کی تاریخی روایتوں میں ایسا اکثر ہوا کہ غیر مشہور لوگوں کے کارناموں کو مشہور لوگوں کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اغلب یہ ہے کہ یہاں بھی انوشیرواں بن خالد کے حالات زندگی نظام الملک کی طرف منتقل کئے گئے ہیں۔

اگر تحقیق کا قدم اور آگے بڑھایا جائے تو اسی حکایت کی تنقید کے لئے اس قدر مواد جمع کیا جا سکتا ہے کہ ایک مستقل تصنیف کی صورت بن سکتی ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ مولانا شبلی جیسے فاضل ادیب نے ایسے اہم مسئلے کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں لکھا۔

آگے چل کر مولانا شبلی نے خیام کے حالات جن کتابوں سے اخذ کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(۱) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی (۲) نزہتہ الارواح شہرزوری۔ جس کو وہ تاریخ الحکما شہرزوری کے نام سے یاد کرتے ہیں (۳) تاریخ الکامل لابن الاثیر (۴) تاریخ الحکماء قفطی (۵) چہار مقالہ نظامی عروضی

---

[1] دیباچہ مذکور صفحہ ید ۔ یہ [2] زبدۃ النصرۃ صفحہ ۶۶

ان پانچ کتابوں میں سے جو حالات اخذ کئے جاسکتے تھے وہ بے شک اُنھوں نے اخذ کرلئے ہیں لیکن ان کتابوں کے
علاوہ اور بھی بہت سی تاریخی اور ادبی کتابیں ہیں جن میں ضمناً خیام کا ذکر آگیا ہے جس کو اخذ کرکے ناظرین کے
سامنے پیش کرنا تذکرہ نویس کا فرض ہے۔ ہر فارسی داں اس بات کو جانتا ہے کہ ایران کے جتنے نامور شاعر
گزرے ہیں مثلاً فردوسی، انوری، حافظ، عطّار، خیام وغیرہ۔ ان سب کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے
ہیں اور جتنی کسی کی شہرت زیادہ ہے اتنا ہی اس کے متعلق معلومات کا ذخیرہ کم ہے حتیٰ کہ حافظ اور فردوسی جیسے
مایۂ ناز شعرا کی تاریخ ولادت و وفات تک محفوظ نہیں رکھی گئی، ایسی حالت میں جب کہ ان اہل کمال کے حالات
زندگی اس درجہ کمیاب ہوں تو ان کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں بھی جو اتفاقیہ طور سے تاریخی کتابوں سے
ہاتھ لگ جائیں ترک کردینا یا ان کی طرف سے بے پروائی برتنا بہت بڑے ادبی نقصان کا موجب ہوسکتا ہے
مولانا شبلی نے خیّام کے ذخیرۂ حالات میں سے جو ان کو بغیر کسی تلاش اور کاوش کے مہیّا مل سکتا تھا نصف کے
قریب بالکل چھوڑ دیا ہے جس سے اس کے سوانح عمری میں بہت بڑی کمی رہ گئی ہے۔ خیام کے متعلق پروفیسر
ژوکوفسکی کا وہ فاضلانہ مضمون جو انھوں نے ۱۸۹۷ء میں روسی زبان میں لکھا تھا اور جس کا ترجمہ انگریزی میں
ڈاکٹر راس نے ۱۸۹۸ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں شائع کیا تھا اس کا علم مولانا کو ضرور تھا
کیونکہ اُنھوں نے خود خیام کے تذکرے کے اخیر میں اس مضمون کا اور اس کے انگریزی ترجمے کا ذکر کیا ہے۔
لیکن شاید وہ اتنی زحمت گوارا نہیں کرسکے کہ اس کو منگوا کر ایک نظر دیکھ لیتے ورنہ اتنی بڑی فروگذاشت
ان سے سرزد نہ ہوتی۔ اس مضمون میں پروفیسر ژوکوفسکی نے ان تمام کتابوں کو جن میں خیام کے حالات تھوڑے
بہت مل سکتے تھے باعتبار قدامت یکے بعد دیگرے ترتیب دے کر ذکر کیا ہے اور جو حالات ہر ایک کتاب میں
میسر آئے ہیں ان کو بھی جمع کیا ہے۔ اس مضمون کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ علاوہ ان پانچ ماخذوں کے جن کا
استعمال مولانا نے کیا ہے اور جن کا اوپر ذکر کردیا گیا ہے پانچ کتابیں اور ہیں جن میں خیام کے حالات ملتے
ہیں اور جو باعتبار ثقاہت کے کچھ کم قابلِ وقعت نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک تو 'مرصاد العباد' تالیفِ شیخ
نجم الدین ابوبکر رازی معروف بہ "دایہ" ہے جو ۶۲۰ھ میں لکھی گئی۔ دوسرے 'آثار البلاد' قزوینی
کی، جو ۶۷۴ھ کی تصنیف ہے۔ تیسرے 'جامع التواریخ' ہے جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ چوتھے 'فردوس التواریخ'

مصنفۂ مولانا خسرو ابرقوہی جو ۸۴۳ھ میں لکھی گئی ہے اور پانچویں تاریخ الفی جو اکبر کے عہد کی مشہور تصنیف ہے۔

ان پانچ کتابوں میں سے خیام کے متعلق جو حالات اخذ کئے گئے ہیں ان کو ہم طوالت کے خوف سے یہاں دہرانا نہیں چاہتے جس کو اشتیاق ہو وہ پروفیسر ژوکوفسکی کے مضمون کا انگریزی ترجمہ یا کتاب چہار مقالہ (طبع یورپ) کے حواشی میں دیکھ لے۔

آگے چل کر مولانا شبلی نے خیام کی رباعیات پر بلحاظ مضامین کے مفصل ریویو کیا ہے اور اس کی شاعری کے محاسن دکھلائے ہیں لیکن تنقیدی حیثیت سے یہاں بھی مولانا ایک بہت بڑی فروگزاشت کے مرتکب ہوئے ہیں۔ خیام کی رباعیات کے مطالعہ کرنے والے کو سب سے بڑی دقت جو پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ رباعیات کا کوئی صحیح نسخہ جو قابل اعتماد ہو سکے ہمارے زمانے تک محفوظ نہیں رہا۔ قلمی نسخے جو یورپ اور ایشیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں موجود ہیں ان میں رباعیات کی تعداد اور ترتیب اس قدر متفاوت ہے کہ ان سب نسخوں کا مقابلہ اور موازنہ کرکے مشترک رباعیوں کی ایک قابل اعتبار تعداد کو نکالنا اور ان کو مناسب طور سے ترتیب دینا ممکن نہیں۔ ان مختلف نسخوں میں رباعیات کی تعداد پندرہ سے آٹھ سو تک ہے اور بعض مطبوعہ نسخوں میں ہزار سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔

خیّام کی اپنی رباعیات کو متعین کرنا تو اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ کوئی قدیم اور صحیح نسخہ دستیاب نہ ہو جو اعتماد کے قابل ہو۔ زبان کا معیار اس بارے میں کارآمد نہیں کیونکہ اوّل تو خیام کے اپنے صحیح انداز کا نمونہ ہمارے پیش نظر نہیں اور اگر ہو بھی تو بہت سے دوسرے اساتذہ مثلاً مولانا روم، عطّار، حافظ، سنائی، انوری، بوعلی سینا وغیرہ کی جو رباعیاں خیام کی رباعیوں کے ساتھ مخلوط ہو گئی ہیں، ان سب کا انداز قریب قریب یکساں ہے اور سب کے مضامین متحد اور متشابہ ہیں لہذا ان میں تمیز کرنا اور صرف انداز بیان سے مصنف کا پتا لگانا محال ہے۔ پروفیسر ژوکوفسکی نے اپنے مضمون میں جس کا اوپر ذکر ہوا نہایت محنت اور تلاش سے خیام کی بیاسی رباعیوں کا کھوج لگا کر بتایا ہے کہ یہ رباعیاں دوسرے شعرا کے دیوانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ نیز ان شاعروں کی فہرست دی ہے جن کی تعداد چالیس سے زائد ہے اور اسی فہرست کو پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ کی دوسری جلد (صفحہ ۲۵۶ و ۲۵۷) میں نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر نکلسن ماہر فارسی، رباعیات خیّام

(طبع لندن ۱۹۰۹ء) کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ پروفیسر ژوکوفسکی کے مضمون لکھنے کے بعد سے اب تک (یعنی ۱۸۹۷ء سے ۱۹۰۹ء تک) اس قسم کی رباعیوں کی تعداد بیاسی سے تجاوز کر کے ایک سو ایک تک پہنچ چکی ہے اور اگر تلاش جاری رکھی جائے تو اور بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ حالات موجودہ میں خیام کی رباعیات کا متعین کرنا دشوار ہے۔ مولانا شبلی نے اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کیا ہے اور ان امور پر بالکل کوئی بحث نہیں کی کہ مثلاً وہ کون سی رباعیاں ہیں جو ممکن طور سے خیام کی اپنی کہی جا سکتی ہیں۔ اس کی رباعیوں کی شناخت ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اگر ہو سکتی ہے تو کیوں کر، کون سا مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخہ زیادہ قابل اعتبار ہے۔ مذاق سلیم کو اس میں کہاں تک دخل ہو سکتا ہے۔ خیام کی رباعیات کا دوسروں کے رباعیات کے ساتھ مخلوط ہونے کا باعث کیا ہے اور کیا وجہ ہے کہ اس کا کلام محفوظ نہیں رہا وغیرہ وغیرہ۔

اس مبحث کو حسب ضرورت طول دیا جا سکتا ہے اور رباعیات کے مطالعہ کرنے والوں کے لئے حد سے زیادہ دل چسپ ہو سکتا ہے بلکہ ہمارا خیال ہے کہ اُن کے لئے بے حد ضروری ہے کیوں کہ جب تک محنت اور تحقیق کے ساتھ خیام کی اپنی رباعیاں، متعین نہ ہو سکیں گی اس کی شخصیت شکوک اور قیاسات کے غبار میں ملفوف رہے گی۔

مولانا شبلی نے اتنا بھی بیان نہیں کیا کہ رباعیات خیام کا کون سا نسخہ ان کے پیش نظر ہے جس میں سے وہ تنقید کے لئے رباعیات کا انتخاب کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ ساری دنیا میں فقط ایک ہی نسخہ جس کا متن متحد ہے دستیاب ہو سکتا ہے جس کی صحت میں کسی کو کلام نہیں لہذا تیا نشان تبانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

جو رباعیاں مولانا نے تنقید کے لئے انتخاب کی ہیں ان میں سے دس ایسی ہیں جو پروفیسر ژوکوفسکی کی اُن بیاسی رباعیوں میں سے ہیں جن کو اُنھوں نے اوروں کی طرف منسوب پایا ہے ان میں سے ہر ایک کا پہلا مصرع ناظرین کی دل چسپی کے لئے لکھ دیا جاتا ہے[1]:-

---

[1] افسوس ہے کہ ژوکوفسکی کا اصلی مضمون جو اُنھوں نے روسی زبان میں لکھا تھا دستیاب نہیں ہو سکتا ورنہ ہم یہ بھی بتا سکتے کہ ان میں سے ہر ایک رباعی کس کی طرف منسوب ہے۔ مضمون کے انگریزی ترجمے میں صرف رباعیاں بتائی گئی ہیں شعرا کا نام نہیں دیا۔

(۱) من بندۂ [illegible] رضائے تو کجاست
(۲) آنم کہ پدید گشتم از قدرتِ تو
(۳) اے چرخ زگردشِ تو خرسند نیم
(۴) گویند کہ فردوس برین خواہد بود
(۵) جمعے متفکرند در مذہب و دیں
(۶) گر از پے شہوت و ہوا خواہی رفت
(۷) ایزد چو نخواست آنچہ من خواستہ ام
(۸) دریاب کہ از روح جدا خواہی رفت
(۹) در دہر ہر آنکہ نیم نانے دارد
(۱۰) با این دو سہ ناداں کہ چناں می دانند

خیام کی تصنیفات کے ذکر میں مولانا شبلی فرماتے ہیں :-

" تصنیفات بہت کم ہیں۔ زیچ جو تیار کی تھی اس کا ہمارے اسلامی ملکوں میں تو پتا نہیں لیکن یورپ نے چھاپ کر شائع کی ہے " (شعر العجم صفحہ ۲۳۰)

خیام کی کوئی زیچ آج تک یورپ میں شائع نہیں ہوئی۔ رباعیات کے علاوہ جو کتاب یورپ نے شائع کی ہے وہ دراصل اُس کا الجبرا ہے جس کا عربی متن مع فرانسیسی ترجمے کے بمقام پیرس ۱۸۵۱ء میں چھاپا گیا ہے یہ الجبرا اور اس کے ساتھ تین تصنیفیں خیام کی اور ہیں جن کا مولانا نے ذکر نہیں کیا اور لطف یہ ہے کہ ان تین میں سے دو اس وقت قلمی نسخوں کی صورت میں موجود پائی جاتی ہیں۔ ایک کا نام " رسالۃ فی شرح ما اشکل من مصادرات اقلیدس " جس کا ایک نسخہ لیڈن کے کتب خانے میں ہے۔ دوسرے " رسالۃ فی الاحتیال لمعرفۃ مقداری الذّہب والفضّۃ فی جسم مرکب منہما " جس کا نسخہ مقام گوتھا (جرمنی) کی لائبریری میں موجود ہے اور تیسرے " لوازم الامکنۃ در فصول و علت اختلاف ہوای بلاد و اقلیم[۱] " ایک دوسری جگہ مولانا نے لکھا ہے :-

" ... خیام مسائل فلسفیہ کے بیان کرنے میں نہایت بخل کرتا تھا۔ اس نے پہلے تو یہ کہہ کر ٹالا کہ میں اس مسئلہ کو اپنی کتاب عرائس النفائس میں بہ تفصیل لکھ چکا ہوں " الخ (صفحہ ۲۲۹-۲۳۰)

کتاب عرائس النفائس جس کو مولانا نے خیام کی تصنیف بتایا ہے اس کے لئے انھوں نے کوئی سند نہیں دی

---

[۱] دیکھو حواشی چہار مقالہ صفحہ ۲۲۰ و ۲۲۱

شہرزوری کی اصل عبارت میں جس کا وہ ترجمہ کر رہے ہیں اور جو بعینہٖ حواشی چہار مقالہ (صفحہ ۲۱۲) میں نقل کی گئی ہے عرائس النفائس کا کہیں ذکر نہیں، ظاہراً اتنی بات انھوں نے اپنی طرف سے بڑھا دی ہے۔

جو مطالب اس مضمون میں بیان کیے گئے ہیں ان کے متعلق یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ ان میں کوئی نئی بات بیان نہیں کی گئی فارسی زبان کے جاننے والے جو بواسطۂ انگریزی تاریخ ایران کا مطالعہ کرتے ہیں، ان باتوں سے بالعموم واقف ہیں۔ البتہ اردو میں شاید ابھی تک ان مطالب کی ترجمانی نہیں ہوئی اور یہی خیال اس مضمون کے لکھے جانے کا باعث ہوا۔ جب کہ شعرالعجم جیسی بلند پایہ کتاب میں ان باتوں کو ترک کر دیا گیا ہے تو یہ فرض کر لینا کہ چھوٹے درجے کی تصانیف میں یہ مباحث لکھے جا چکے ہیں بعید از قیاس ہے۔

اقبالؔ

اوحدالدین انوری

قولہ " محمد نام، اوحدالدین لقب، انوری تخلص ابیورد کے علاقے میں بدمنہ ایک گاؤں ہے، جو مہنہ کے مقابل واقع ہے، انوری یہیں پیدا ہوا، یہ دولت شاہ کا بیان ہے، لیکن عرفی کہتا ہے ع انوری گر بود از مہنہ منم از شیراز " (شعرالعجم ص ۲۶۴)

انوری کے کلیات کا جامع جس نے انوری کی وفات کے بعد بہت جلد اس کا کلام جمع کیا ہے اور اس پر ایک مختصر دیباچہ بھی لکھا ہے اس کا نام علی بتاتا ہے۔ صاحب دیباچہ کے الفاظ ہیں۔

" امیر حکیم امام ہمام اوحدالدین عماد الاسلام نادرۃ الفلک اعجوبۃ الزمان افصح فصحاء الدہر ملک الکلام والشعرا علی الانوری نور اللہ مرقدہ و مثواہ و عرف بفضلہ ثراہ "

البتہ محمد اس کے باپ کا نام تھا اس پر محمد عوفی اور شادی آبادی[ع] متفق ہیں۔ دادا کا نام اسحٰق تھا

ع شرح قصائد انوری از محمد بن داؤد بن محمد علوی شادی آبادی مصنف شادی آباد عرف مانڈو کا رہنے والا ہے اور سلطان ناصرالدین مالوی ۹۰۵ھ و ۹۱۶ھ کی فرمائش پر اس نے یہ شرح لکھی ہے۔

انوری کے کلیات سے ثابت ہے **شعر**

زندہ اسلاف تو تبو چو من　　جدم اسحٰق وجدت اسمٰعیل عہ

وطن کے متعلق اگرچہ مورخین میں اختلاف ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ خاوران ہے انوری خود ایک سے زیادہ مقام پر اپنے آپ کو خاوران کی طرف منسوب کرتا ہے۔ قطعۂ ذیل اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہر سپہر صیت پیدا شد زخاکِ خاوراں　　تا شبانگاہِ ابد چار آفتاب خاوری
خواجۂ چوں بوعلی بشدانی آں صاحب قراں　　مفتیٔ چوں اسعد شوجاں نہ ہر شرکے بری
صوفیٔ صافی چو سلطانِ طریقت بوسعید　　شاعرے ساحر چو مشہورِ خراساں انوری عہ

شعر وے زخاکِ خاوران چوں ذرہ مجہول آمدہ　　گشتہ امروز اندر و چوں آفتابِ خاوری عہ

〃 چنداں کہ از زبانت برآید بگیر زر　　در خاوراں نیم کہ میسر نمی شود عہ

〃 کاندر اطراف خاوراں از وے　　ہیچ کس را ہمی نیابد یاد عہ

خاوراں ایک ناحیہ کا نام ہے جس میں مہنہ، نسا، ابیورد اور درگز شامل ہیں لیکن یہ بھی یاد رہے کہ خاوراں ناحیہ ہونے کے علاوہ ایک قصبہ کا نام بھی ہے اور انوری اسی قصبے کی طرف منسوب ہے عہ

قولہ " انوری نے اسی وقت تعلیم و تعلم کو خیرباد کہا اور رات بھر میں قصیدہ لکھ کر تیار کیا جس کا مطلع یہ ہے:۔

گر دل و دست بحر و کاں باشد　　دل و دستِ خدایگاں باشد

صبح کو دربار میں جا کر قصیدہ پڑھا، سنجر نہایت سخن شناس تھا بہت محظوظ ہوا اور کہا

عہ کلیات انوری، طبع نول کشور ص ۲۶۱ یہ کلیات نول کشور کے ہاں ۱۸۸۰ء اور ۱۸۹۷ء میں چھپ چکا ہے پہلی اشاعت میں ۷۶، اور دوسری میں ۶۶، صفحات ہیں۔ میں نے اس مضمون کے دوران میں پہلی اشاعت سے کام لیا ہے۔ بخیال اختصار آئندہ صرف شمار صفحات پر اکتفا کی جائیگی۔ عہ ایضاً کلیات ص ۱۴۷ عہ ایضاً کلیات ص ۴۰۳ عہ کلیات ص ۲۴۴ عہ ایضاً ص ۱۲۳
عہ معجم البلدان از یاقوت حموی نزہت القلوب حمد اللہ مستوفی ص ۱۸۹ طبع ملک الکتاب ۱۳۱۱ھ بمبئی

نوکری چاہتے ہو یا صلہ، انوری نے آداب بجالا کر عرض کی۔

جز آستانِ توام در جہاں پناہے نیست سرِ مرا بجز ایں در حوالہ گاہے نیست

سنجر نے منصب اور وظیفہ مقرر کردیا، سنجر راد گاں سے روانہ ہوا تو انوری بھی ساتھ تھا، راہ میں چند قصیدے لکھ کر پیش کیے جن میں سے ایک یہ ہے:

بازایں چہ جوانی و جمال ست جہاں را ویں حال کہ نوگشت زمین را و زماں را"

شعرالعجم صد ۲۶۴

شعر جز آستانِ توام الخ خواجہ حافظ کی غزل کا مطلع ہے جو ان کے دیوان میں موجود ہے اور انوری سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

راد گان سے روانگی کے وقت جو قصیدہ سنایا جاتا ہے اور جس کا مطلع اوپر درج ہے بے شک انوری کا ہے لیکن سلطان سنجر کی تعریف میں نہیں ہے بلکہ عماد الدین پیروز شاہ اور اس کے وزیر جلال الوزرا کی مدح میں ہے کلیات (مطبوعہ) میں یہ سب سے پہلا قصیدہ ہے یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں ممدوح کا نام موجود ہے۔

پیروز شہِ عادل و منصور و مظفر کز عدل دگر بارہ بنا کرد جہاں را (کلیات صد ۳)

اور یہ شعر بھی ؎

دستور جلال الوزرا کز درِ عالیش انصاف رسانند ہر انصاف رساں را صد ۵

قولہ "ہمارے تذکرہ نویسوں کی بے خبری دیکھو، یہ واقعہ سب لکھتے آتے ہیں، لیکن یہ کسی سے نہ ہو سکا کہ جس قصیدے کو انوری کی شاعری کا دیباچہ کہتے ہیں اس کو کبھی اٹھا کر دیکھ بھی لیا ہوتا، انوری خود اس قصیدے میں کہتا ہے ؎

خسروا بندہ را چو دہ سال ست کہ ہمی آرزوے آں باشد
کز ندیمانِ مجلس ار نشود از مقیمان آستاں باشد

اس میں صاف تصریح ہے کہ یہ قصیدہ ابتداً نہیں، بلکہ دس برس کی امیدواری کے بعد لکھا گیا ہے،، (شعرالعجم صد ۲۶۵)

اگر واقعی سب سے پیش تر یہ اعتراض مولانا شبلی کو سوجھا ہے تو وہ تہ دل سے مبارک باد کے مستحق ہیں لیکن میرا عقیدہ ہے کہ علامہ موصوف اس معاملہ میں پروفیسر براون کی تاریخ ادبیات ایران کے مرہون منت ہیں اگرچہ بظاہر اس سے استفادہ تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر براون کے الفاظ ہیں :

" امر فی الواقع یہ ہے کہ قصیدۂ مذکورہ خود ایسی شہادت پیش کرتا ہے کہ شاعر بڑی مدت پیش تر سے مشق سخن میں مصروف تھا۔ **اشعار**

خسروا بندہ را چو دہ سال ست — کش ہمی آرزوے آں باشد
کز ندیمانِ مجلس ار نشود — از مقیمانِ آستاں باشد "

(تاریخ ادبیات ایران صفحہ ۳۸۰، طبع ۱۹۰۶ء)

قولہ " رفتہ رفتہ یہ مرتبہ حاصل کیا کہ سنجر نے بہ آں جاہ و جلال دو دفعہ انوری کے مکان پر جا کر اس کی عزت افزائی کی" (شعر العجم صفحہ ۲۶۶)

دس سال کی اُمیدواری کے باوجود جیسا کہ گزشتہ اشعار سے واضح ہوتا ہے انوری سنجر کے دربار میں منادمت برطرف، مقیم آستان بننے کا رتبہ بھی حاصل نہ کر سکا اور اگر اسی رفتار سے اُس نے ترقی کی ہے تو سنجر کو اُس کے گھر آنے کے لئے عمرِ نوح درکار ہے۔

میں سنجر اور انوری کے تعلقات کی بابت اسی مضمون کے دوران میں کسی موزوں مقام پر گفت گو کروں گا یہاں اسی قدر کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انوری کے گھر سنجر کے آنے کی روایت کی اصلیت صرف اس قدر ہے کہ ایک مرتبہ کوئی وزیر انوری کے مکان پر آیا تھا اور شاعر نے اس کے خیر مقدم میں قصیدہ قطعہ اور رباعی لکھے ہیں چنانچہ **رباعی**

منصوبہ سر گزشت در آمد بضمیر — کاید بدرت موکبِ میمونِ وزیر
ہیں کوکبِ غنچہ بیا و دست ببوس — ہاں دستِ چنار گو بیا دست بگیر (کلیات صفحہ ۵۶۸ طبع نولکشور)

کسی اور قطعہ میں کہتا ہے ؎

بچیزے دیگر ایں تشریف را تشبیہ نتواں کرد — حدیثِ مصطفےٰ میداں و بو ایوبِ انصاری (کلیات صفحہ ۴۱۱)

قطعہ ذیل بھی ملاحظہ ہو ؎

ای خداوندی کہ بنّای جہاں یعنی خدای / گوہر پاک ترا اصلِ نکوکاری نہاد

آستانِ ساحتِ جاہ ترا چوں برکشید / عقلِ کُلّی پایۂ برخاکش بدشواری نہاد

فتنہ را خوابِ ضروری دیدہ از گیتی بدوخت / چوں قضا در دیدۂ بختِ تو بیداری نہاد

دے حیات تو نہاد ستے مرا در تن چنانک / باللّٰہ ار در خاک ہرگز ابر آذاری نہاد

عذر آں اقدام چوں خواہم کہ خاکش را سپہر / سرمۂ چشمِ خداوندی و جبّاری نہاد

شاد باش اے مصطفیٰ سیرت کہ خلق شاملت / بے تکلف بر تکبر داغِ بیزاری نہاد

از شرف در عرضِ من عرفی نہاد ستے چنانک / مصطفیٰ در نسل بو ایوب انصاری نہاد (ص ۶۴۹)

اسی سلسلے میں وہ قصیدہ لکھا گیا ہے جس کا مطلع ہے ؎

زہے از کلکت اندر چشمِ دولت کحلِ بیداری / بعونش کردہ مدتہا جہانباناں جہانداری

یہ عقیدہ کہ قصیدہ کسی وزیر کی تعریف میں ہے، رباعی بالا کے علاوہ ذیل کے ابیات سے بھی مفہوم ہوتا ہے ؎

مجیر دولت و دینی و اندر دیدۂ دولت / ز رائے تست بینائی ز بختِ تست بیداری

تو آں صدری کہ عالم را کمال آمد وجودِ تو / نگر تا خویشتن را کمتر از عالم نہ پنداری

ناظرین اسی قصیدے کے یہ اشعار ملاحظہ کریں ؎

ترا لطفِ تو داعی بود اگر نہ کس روا دارد / کہ رختِ کبریا ہرگز بچوناں کلبۂ آری

نزولت را بہ نزدِ من مثل دانی چہ می آرم / نزولِ مصطفیٰ نزدیک بو ایوبِ انصاری (کلیات ص ۳۷۰-۳۶۹)

قولہ" انوری جس طرح سنجر کے دربار میں پہنچا ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ انوری مدت سے شعر و شاعری میں مشغول تھا، لیکن دربار میں رسائی حاصل نہیں ہوتی تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ دربار کا ملک الشعرا امیر معزی تھا اور وہ کسی کو دربار میں کامیاب نہیں ہونے دیتا تھا اس کا حافظہ نہایت قوی تھا، یعنی صرف ایک بار کے سننے میں قصیدے کا قصیدہ یاد کر لیتا تھا، جب کوئی شاعر دربار میں آتا اور قصیدہ سناتا تو معزی بادشاہ سے کہتا کہ یہ قصیدہ

میری تصنیف ہے، چنانچہ قصیدے کا قصیدہ خود پڑھکر سنا دیا، شاعر خفیف ہو کر چلا آتا

انوری کو یہ حالت معلوم ہوئی تو پھٹے پرانے کپڑے پہن، پاگلوں کی صورت بنا کر، معزی

کے پاس گیا اور کہا کہ میں شاعر ہوں، بادشاہ کی مدح میں قصیدہ لکھکر لایا ہوں آپ پیش

کرا دیجئے، معزی نے پوچھا کیا لکھا ہے پڑھکر سناؤ، انوری نے پڑھا ؎

زہے شاہ و زہے شاہ و زہے شاہ　　زہے میر و زہے میر و زہے میر

معزی نے کہا یوں کہتے تو مطلع ہو جاتا ؎

زہے شاہ و زہے شاہ و زہے شاہ　　زہے ماہ و زہے ماہ و زہے ماہ

انوری نے بہکی بہکی باتیں کیں، معزی نے یہ سمجھکر کہ دربار کا مسخرہ بنائیں گے، انوری سے

کہا، کل آنا، انوری دوسرے روز پہنچا تو معزی خود ساتھ لے کر دربار میں آگیا اور کہا کہ

جو قصیدہ تم نے مدح میں لکھا ہے، سناؤ۔ انوری نے شاعرانہ انداز میں پڑھا ؎

گر دل و دست بحر و کاں باشد　　دل و دستِ خدائگاں باشد

شاہِ سنجر کہ کمتریں خدمش　　در جہاں بادشہ نشاں باشد

دو شعر پڑھکر رک گیا اور معزی کی طرف خطاب کر کے کہا کہ اگر یہ قصیدہ آپ کا ہے تو باقی

اشعار سنائیے۔ معزی چپ ہوا، انوری نے پورا قصیدہ سنایا سنجر نہایت محظوظ ہوا اور

ندیمانِ خاص میں داخل کیا"　　(شعر العجم صفحہ ۲۶۶ و ۲۶۵)

پروفیسر براؤن نے اس قصے کو حبیب السیر سے بتمامہ نقل کر کے اس پر کوئی تنقید ظاہر نہیں کیا ہے میں اس

خیال میں پروفیسر موصوف کا تابع ہوں علامہ شبلی نے اس کے بعض خط و خال قلم انداز کر دیئے ہیں۔ میں اس

روایت کے اس غیر معمولی پہلو سے جس میں ایک شخص کا حافظہ اس قدر قوی مان لیا جائے کہ ایک مرتبہ کے

سننے میں کامل قصیدہ از بر کر سکتا ہے، اس کا فرزند دو مرتبہ کی سماعت میں یاد کر لیتا ہے اور ان کا غلام تین مرتبہ

کی سماعت میں حفظ سنا سکتا ہے اور حسن اتفاق سے ان بوالعجب ہستیوں کا اجتماع ایک ہی وقت میں اور ایک ہی

خاندان میں ہوتا ہے قطع نظر کر کے اس قدر کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انوری کے معتقدین نے نہ صرف اس قصے میں

بلکہ اور موقعوں پر بھی امیر معزی کو بدنام اور مطعون کرنے کی کوشش کی ہے مثال میں انوری کا ایک شعر پیش ہے۔

برسرِ من مغفری کردی کلہ داں برگزشت — بگزر و بر طیلسانم نیز دور معجزی

شادی آبادی اس شعر کی تشریح میں کہتے ہیں :۔

"دریں بیت رمز آنست کہ امیر معزی بحضرت انوری از روئے حسد تہمتے دروغ کردہ بود و پیش پادشاہ تعریض کردہ کہ انوری شہر بلخ را ہجو کردہ پادشاہ بدو منقلب شد و حکیم انوری را مقنعۂ زناں پوشانید و تشہیر کرد و خواست تا حضرت انوری را بر خر سوار کند و گرد شہر بگرداند چوں حکیم مذکور ایں قصیدہ را گفت و پادشاہ را مع کبرائے بلخ تعریف کرد باز داشتند و بخر سوار نہ کردند و مہرباں شدند"

حالانکہ امیر معزی ۵۴۲ھ میں سنجر کے ہاتھ سے مارا جاتا ہے اور ہجو بلخ کا واقعہ سنجر (متوفی ۵۵۲ھ) کی وفات کے بہت عرصہ بعد طغرل تگین کے دور میں ہوتا ہے۔

شادی آبادی نے ایک اور واقعہ انوری کے ایک اور شعر کی شرح میں لکھا ہے۔ شعر یہ ہے ۔

کس ندانم از اکابر گردن کشانِ نظم — کو را صریح خون دو دیوان بگردن ست

شادی آبادی کہتے ہیں ۔

"امیر معزی کہ سر آمد شعرائے زمانہ بود و پیش سلطان سنجر مرتبہ و تقرب بسیار داشت از دیوان مولانا احمد معالی [بلمعالی نحاس؟] دزدیدہ است و ہر دو دیوان را ہلاک کردہ است و دیوان خود ساختہ است"

علاوہ بریں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ انوری کا سرپرست سلطان سنجر کا آخری وزیر ابو الفتح ناصر الدین طاہر ابن مظفر ابن نظام الملک (۵۲۸ھ و ۵۴۸ھ) تھا۔ کلیات میں اس وزیر کی مدح میں بیسیوں قصیدے اور قطعات ہیں اس لئے قوی احتمال کیا جا سکتا ہے کہ ایسے طاقتور وزیر کے مقابلے میں امیر معزی کی کوشش دربار میں انوری کی رسائی کے برخلاف چنداں سرسبز نہیں ہو سکتی تھی۔

قولہ " انوری کو علم نجوم میں کمال تھا، سنجر کے عہد حکومت میں اتفاق سے سبعہ سیّارہ

برج میزان میں جمع ہوئے، انوری نے اس بناپر پیشین گوئی کی کہ فلاں دن اس زور کا طوفان آئے گا کہ تمام مکانات برباد ہو جائیں گے، لوگوں نے ڈر کر، تہ خانے اور سرد آب طیار کرائے اور تاریخ مقررہ پران میں چھپ کر بیٹھے، اتفاق سے اس دن اتنی ہوا بھی نہ چلی کہ چراغ گل ہوتا سنجر نے انوری کو بلا کر عتاب کیا، انوری نے کہا قرانات کے احکام فوراً ظاہر نہیں ہوتے۔

فرید کاتب نے اس پر قطعہ لکھا ؎

گفت انوری کہ از جہتِ بادہائے سخت ویراں شود عمارت وکہ نیز بر تری

در سالِ حکم او نوزیدست ہیچ باد یامرسل الریاح تو دانی و انوری (شعر العجم ص ۲۶۶)

یہ سبعہ سیارہ کا اقتران نہیں تھا بلکہ پانچ ستاروں کا لیکن سلطان سنجر کے عہد میں نہیں کیونکہ اس کا انتقال ۵۵۲ھ میں ہوتا ہے اور ستاروں کا اجتماع لبسند نزہت القلوب حمد اللہ مستوفی ۵۸۱ھ میں اور لبسند کامل ابن الاثیر ۲۹ جمادی الآخر ۵۸۲ھ کو ہوتا ہے۔

فی الواقع انوری نے اس طوفان کے متعلق اگر کوئی اشعار لکھے ہیں تو وہ ہم تک نہیں پہونچے۔ کلیات میں پسر سرداد کے مدحیہ قصیدے میں البتہ ایک تلمیح پائی جاتی ہے جس سے اس قدر ضرور مفہوم ہوتا ہے کہ انوری طوفان کی شدّت کی اس نوعیت کا جو مولانا شبلی کے بیان سے مترشح ہے اور جس کو تمام تذکرہ نویس ایک مبالغہ آمیز طریق سے بیان کرتے آئے ہیں ہرگز ہرگز معتقد نہیں تھا۔ وہ ایک طوفان کا ضرور منتظر تھا لیکن نہ ان خوفناک نتائج کے ساتھ جو بالعموم اس کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ وہ تلمیح شعر ذیل میں ملتی ہے۔

آباد دار نیمۂ خود از جہاں بداد طوفانِ باد نیمۂ خود گو خراب خواہ کلیات ص ۳۹۳

مقطع میں یہی شعر کسی قدر تغیّر کے ساتھ یوں لایا گیا ہے۔

آباد دار ملک زمیں خسروا بداد طوفانِ باد ملکِ ہوا گو خراب خواہ ص ۳۶۳

طوفان کا ذکر اکثر معتبر تاریخوں میں ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قضیہ ان ایام میں بہت کچھ بحث و جدال اور مناظرات کا مورث ہوا ہے۔ اس بحث میں جیسا کہ پروفیسر براون نے ذکر کیا ہے ظہیر فاریابی نے سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا ہے۔

وہی قطعہ جو فرید کاتب کی طرف منسوب ہے قصائدِ ظہیر میں بھی موجود ہے و ہو ہذا۔

میگفت انوری کہ شود باد ہا چنانک — کوہِ گراں زپاے درآید چو بنگری

سالے گزشت و برگ نجنبید از درخت — یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

(قصائدِ ظہیر ص۱۴۵، طبع نول کشور ۱۸۸۱ء)

سیّاروں کے اقتران کا ذکر ذیل کے اشعار میں آتا ہے۔

اجتماعِ اختراں دانی کہ در میزاں چرا ست — خود نکو دانی کہ آں صنعت چہ نیکو کردہ اند

از برائے ذرّہٴ خاکِ کفِ پائے ترا — نقدِ ہفت اقلیمِ گردوں در ترازو کردہ اند (قصائدِ ظہیر ص۱۶۵)

ظہیر نے طوفان کے بطلان میں کوئی رسالہ بھی لکھا ہے۔ اشعارِ ذیل ملاحظہ ہوں

رسالتے کہ زانشاے خود فرستادم — بمجلسِ تو در ابطالِ حکمِ طوفانی

اگر درآں سخنم شبہے ست ومیخواہی — کہ از جریدہٴ ایام نیز برخوانی

مراچناں کہ بود ہم میعشتے باید — کہ بے غذا نتواں داشت روحِ حیوانی

(قصائدِ ظہیر ص۱۷۱)

ظہیر جن ایام میں طوفان کی نزاع میں مصروف تھا آذربائجان میں مقیم۔ قزل ارسلاں ۵۸۲ھ میں قتل ہوتا ہے اور نظامی کا ممدوح ابوبکر نصرۃ الدین اس کا جانشین ہوتا ہے۔ قطعہٴ ذیل میں ظہیر کا مخاطب یہی نصرۃ الدین معلوم ہوتا ہے۔ شاعر شکایت کرتا ہے کہ جس شخص نے اپنی پیشین گوئی میں کہا تھا کہ طوفان باد سے دنیا تباہ ہو جائے گی اس کو تم نے خلعت اور انعام سے سرفراز کیا لیکن میرے ساتھ جس نے اس کی پیشین گوئی کی تردید کی ہے اور ہی طرح کا سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔

شاہا زکوۃِ گوشش زباں را زدی نقط — بشنو زمن سوالے وتشریف دہ جواب

آنکس کہ حکم کردہ بطوفان باد و گفت — کاسیب آں عمارتِ گیتی کند خراب

تشریف یافت از تو واقبال دید و جاہ — دربندِ آں نہ شد کہ خطا گفت یا صواب

من بندہ چوں خطاے وے ابطال کردہ ام — با من چرا زوجہ وگرمی رود جواب (قصائدِ ظہیر ۱۶۴)

قولہ "انوری نے اب دربار میں رہنا مناسب نہ سمجھا اور ترک ملازمت کرکے نیشاپور چلا آیا۔ اب اس کی شہرت دُور دُور پھیل گئی تھی، ہر طرف سے امرا و رؤسا کے پیغام آتے تھے کہ ہمارے دربار میں قدم رنجہ کیجئے، ۵۴۳ھ میں سلطان احمد پیروز شاہ نے اس کو خط بھیج کر بلایا اور ساتھ لے کر خوارزم کی طرف روانہ ہوا، انوری یہ سُن کر کہ دریائے جیحوں راہ میں پڑتا ہے اس قدر ڈرا کہ بلخ پہنچکر سلطان احمد سے معذرت چاہی اور وہیں رہ گیا، لیکن بلخ میں اس قدر تکلیف پہنچی کہ تنگ آکر ایک قصیدہ لکھا اور سلطان احمد کی خدمت میں بھیجا مطلب کی بات اس طرح ادا کی۔

این حال کہ در بلخ کنوں دارم | از خوف پریشانی و گمراہی
زیں بیش اگر وہم و گماں بردے | آں مخطے کو نہ نظر ساہی
بر عبرہ جیحوں نہ با آموزش | چوں بط بہ طبیعت شدے راہی

سلطان احمد نے اسی کو دربار میں طلب کیا اور معتمد خاص بھیجا کہ انوری کو ساتھ لے کر آئے" (شعر العجم ص ۲۶۷)

یہ خیال کہ پیشین گوئی غلط ثابت ہونے کی بنا پر انوری سنجر کے دربار سے قطع تعلق کرکے نیشاپور چلا جاتا ہے درست نہیں معلوم ہوتا۔ سنجر اور انوری کے تعلقات میں کبھی کوئی تغیر رونما نہیں ہوا۔

سلطان احمد پیروز شاہ کے سوانح کے متعلق تاریخیں خاموش ہیں۔ کلیات اس قدر روشنی ڈالتا ہے کہ ابتدا میں وہ ایک خطائی شہزادہ تھا اور سنجر کے عہد سے آٹھ نو سال بعد خراسان کے بعض حصے جن میں بلخ اور ترمذ قابل ذکر ہیں اس کے تصرف میں آجاتے ہیں جن میں موخر الذکر مقام کو وہ اپنا پایۂ تخت بنالیتا ہے وہ کوئی سلجوقی شہزادہ نہیں تھا انوری کے شعر سے واضح ہوتا ہے ؎

زشیر بیشۂ سلجوقیاں بیک جولاں | شکارے کہ بصد سال کردہ بر بودہ | ص ۳۶۳

لیکن خوارزم شاہیوں سے بھی اس کا کوئی علاقہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ انوری اس کو خطائی مانتا ہے بلخ پر پہلی مرتبہ قابض ہونے کے بعد بعض مصلحتوں کی بنا پر وہ اس کو چھوڑ دیتا ہے اور اس وقت ہمارے شاعر کے اس کے ساتھ گہرے تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ کلیات میں ایک سے زیادہ موقعوں پر انوری

پیروزشاہ کے بلخ چھوڑنے پر اپنا افسوس ظاہر کرتا ہے **شعر**

تو میروی وزمین وزماں ہمی گویند ۔۔۔ زہے زعدل تو خلقِ خدائے آسودہ ۔۔۔ ص ۳۶۴

پیروزشاہ جس وقت ترمذ کو مستقلاً اپنا صدر مقام بنالیتا ہے انوری جو آن ایام میں بلخ میں قیام پذیر ہے اس کے دربار میں حاضری کا اشتیاق اپنے بعض قصائد میں ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً:

قسم زخدمتِ تو بدوری چرا فتاد ۔۔۔ گفت انوری بہانہ چہ آری گناہِ تست

گفتم کہ آبِ جیحوں گفتا خری مکن ۔۔۔ بگزر کہ عالمے ہمہ آب و گیاہ تست

گفتم کہ طالعے ظلے ہست گفت نیست ۔۔۔ عیب از خیالہائے دماغ تباہ تست

یوسف نہ و بیژن اگر نہ بہ گفتمے ۔۔۔ کاندر ازائے مجلس شہ بلخ چاہ تست ۔۔۔ ص ۵۵

ایک اور قصیدے میں جو عماد الدین پیروزشاہ کے بلخ چھوڑنے کے سات ماہ بعد لکھا جاتا ہے انوری کہتا ہے ؎

خسروا من بندہ را در مدتِ این ہفت ماہ ۔۔۔ گر میسّر گشتے اندر ہفت کشور یاورے

تا مرا از بحۂ دریائے حرماں دوست دار ۔۔۔ فی المثل بر تختۂ بروے کشاں تا معبرے

ہستمی از بس کہ سر بر آستانت سودمے ۔۔۔ چوں دگر ابنائے جنسِ خویش اکنوں سرورے

لیکن از بس قصد این ناقص عنایت روزگار ۔۔۔ ماندہ ام در قعرِ دریائے عنا چوں لنگرے ۔۔۔ ص ۳۷۴

پیروزشاہ آخرکار اپنے وزیر جلال الوزرا کو اس کی طلبی کا حکم دیتا ہے۔ وزیر انوری کے نام فرمان طلب روانہ کرتا ہے۔ جواب میں شاعر ایک قطعہ لکھتا ہے جس کے بعض اشعار حوالۂ قلم ہوتے ہیں ۔۔

مثالِ عالی دستور چوں بہ بندہ رسید ۔۔۔ قیام کرد و ببوسید و بر دو دیدہ نہاد

مرا بخدمتِ شہ خواندہ کہ خدمتِ او ۔۔۔ کند سپہر کہ ہست او زمانہ را بنیاد

عمادِ دولت و دیں آں کہ حصنِ دولت و دیں ۔۔۔ پس از وفور خرابی از و شدند آباد

شہ مظفر پیروزشہ کہ فتح و ظفر ۔۔۔ زسایۂ علم و شعلۂ سنانش زاد ۔۔۔ ص ۶۴۱

علامہ شبلی شاعر کے طلب کئے جانے کی تاریخ ۵۳۳ھ بیان کرتے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ انوری کا بیان

اس کے متعلق بالکل صاف ہے **شعر**

اندر آمد ز درِ حجرۂ من نیم شبے　　　روز بهمنجنہ یعنی دوم بهمن ماہ

سال بُد پانصد وسی وسہ تاریخ عجم　　　گفت برخیز کہ از شہر برون شد ہمراہ　ص۳۵۷

شاعر کا مقصد یہاں سن یزدجردی سے ہے جو ان ایام میں عام طور پر ایران میں رائج تھا۔ سن ہجری اس وقت ۵۶۰-۶۱ھ کے مابین ہونا چاہیئے۔

قولہ "اقسام سخن میں سے انوری کی طبیعت ہجو سے خاص مناسبت رکھتی تھی، ہجو میں وہ نہایت دل چسپ اور لطیف مضامین پیدا کرتا تھا، جو شعر اس کی زبان سے نکلتا عالم میں پھیل جاتا۔ اس کے ساتھ طبیعت میں تنک ظرفی اور کم حوصلگی تھی، ذرا کسی سے رنج ہوا اور اس نے ہجو کا طومار باندھ دیا اس عادت کی وجہ سے اس نے سارے زمانے کو دشمن بنا لیا تھا"۔ (شعر العجم ۲۶۹)

اس پر مجکو ایک انگریزی ضرب المثل یاد آتی ہے کہ "پہلے کتے کو بدنام کردو پھر شوق سے اس کو پھانسی دو"۔ ایک شاعر کے کمالات سے انکار کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کے کمترین اوصاف کو خوب چمکایا جائے اور اصلی کمال سے اغماض کیا جائے۔ چونکہ علامہ شبلی کے گوشۂ خاطر میں ظہیر فاریابی کے مبالغہ آمیز احترام نے اپنا گھر بنا لیا ہے اس لئے غریب انوری کو مشکل سے بیرون آستاں جگہ دی جاتی ہے۔ دو تلواریں تمام دنیا جانتی ہے ایک نیام میں نہیں آتیں اسی لئے مجکو حیرت ہے کہ انوری کو شعر العجم کے مشاہیر میں کیوں داخل کیا گیا اور کیوں اس کے ساتھ بے مہر مادر کا سا سلوک جائز رکھا گیا۔

انوری کے کمالات سے جس نے اپنے وطن کی تاریخ کے بعض نہایت تاریک موقعوں پر اپنی شاعری کے ذریعے سے عظیم الشان کارنامے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور جس نے اپنی طبعی شرافت اور اخلاقی جرأت کا شاندار ثبوت دیا ہے مولانا کو اسی قدر یاد رہا کہ ہجو میں وہ نہایت لطیف مضامین پیدا کرتا ہے۔ لیکن طبیعت کا دنی اور تنک ظرف ہے۔

متقدمین کے بیانات نیز کلیات کے تتبع سے یہ امر محقق نہیں ہوتا کہ انوری کو ہجو میں کوئی خاص شغف تھا ہجو اتفاقیہ انوری کے ہاں بھی پائی جاتی ہے جیسے اور شعرا کے کلام میں لیکن یہ کہنا کہ جہاں کسی سے ناراض ہوا

ہجو کہدی اور اس طرح ساری دنیا کو اپنا مخالف بنالیا میرے خیال میں واقعات پر مبنی نہیں۔ انوری فرشتہ نہیں تھا انسان تھا بعض معاصرین سے اس کی عداوت ضرور رہی ہے اور یہ تلخ تجربہ ہر شاعر اور ہر انسان کو ہوا کرتا ہے لیکن اس کے دشمنوں کے مقابلے میں اس کے دوستوں اور مداحوں کا دائرہ زیادہ وسیع تھا۔ بڑے بڑے لوگوں سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ صدور اور امرا اس کی عزت کرتے تھے۔ سلاطین اور وزرا اس کا احترام کرتے تھے ان میں سے بعض نے اس کے قطعات کے جواب میں قطعات لکھے ہیں۔ ہیں بعض کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

(۱) قاضی حمیدالدین صاحب مقامات حمیدی (المتوفی ۵۵۹ھ) اس عہد کے نہایت مشہور شاعر فاضل اور ادیب ہیں۔ انوری سے ان کا رشتۂ اتحاد بے تکلفی کی حد تک پہونچا ہوا تھا دونوں ایک دوسرے کے کمال کے معترف تھے اور دونوں نے مختلف موقعوں پر ایک دوسرے کے حق میں قطعات لکھے ہیں۔
انوری کے ایک قطعہ کے جواب میں جس سے شبلی نے دو شعر نقل کئے ہیں قاضی صاحب لکھتے ہیں۔

مرا انوری آں چو دریا تونگر — ہمی از سخن زادۂ کاں فرستد
چو بے برگیم گشت او را مقرر — ز خلد بریں نیم ہمی خواں فرستد
جو ہر گنج را جائے ویرانی آمد — ازاں گنج خود سوئے ویراں فرستد
بناناداں دوست کو دوستاں را — غذائے دل و راحتِ جاں فرستد ص۶۶۴

ایک موقعے پر قاضی صاحب انوری سے دریافت کرتے ہیں کہ خدا کا علم ہر شے پر محیط ہے اور تمام واقعات اس کے ارادے کے مطابق ظہور پزیر ہوتے ہیں لیکن خدا جب چاہے اس میں تغیر پیدا کرسکتا ہے کیوں کہ وہ قادر مطلق ہے لیکن دکھا جاتا ہے کہ مشیت الٰہی میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی آخر اس کی کیا وجہ ہے۔

اوحدالدین کہ در سوال و جواب — بدھد داد علم و بستاند
بہ بزرگی جواب ایں فتویٰ — بکند چوں بفضل برخواند
آں کہ داند کہ حال عالم چیست — پس تواند کزاں بگرداند
ہم براں گر بماند از چہ بود — عقل اینجا فرو ہمی ماند ص۶۶۵

انوری جواب دیتا ہے۔

اے بزرگِ جہاں حمید الدیں　　　که خرد مدح تو ہمی خواند
وانکہ از ہیچ روئے نتواں گفت　　　که نداند ہمی و نتواند
ماند یک چیز آں که خود نکند　　　گرچه جائے تواند و داند
زاں که بر بے نیاز واجب نیست　　　که پئے نفع کس قضا راند
لم درا فعال او نباید ازاں　　　که سبب درمیانه ننشاند
غنی مطلق از غرض دوریست　　　فعل او کے بفعلِ ما ماند
ہیچ تدبیر نیست جز تسلیم　　　خویش رابیش ازیں نرنجاند　صـ۶۶۵

(۲) شجاعی ایک شاعر ہے جو انوری کو لکھتا ہے۔

اے انوری تو ئی که بفضل و ہنر بوند　　　احرار روزگار و افاضل ترا رہی　صـ۷۵۲

اور جواب میں انوری لکھتا ہے۔

شجاعی اے خط و شعر تو دام و دانۂ عقل　　　ہزار مرغ چو من صید دام و دانۂ تو

میں بخوف طوالت صرف ایک ایک شعر پر قناعت کرتا ہوں پورے قطعوں کے لئے کلیات ملاحظہ ہو۔

(۳) تاج الافاضل فخر الدین خالد بن ربیع المسالکی سے انوری کی گہری دوستی تھی وہ کہتے ہیں

سلام علیک انوری کیف حالک　　　مرا حال بے تو نہ نیک است بارے

(۴) ارشد الدین ایک اور شاعر ہے جس کے قطعہ کے جواب میں انوری کہتا ہے ؎

ہیچ دانی ارشد الدین کز کف و طبعِ تو دوش　　　من چه شربتہاے آبِ زندگانی خوردہ ام　صـ۶۰۲

(۵) کمالی شاعر انوری کا معاصر ہے اس کے قطعہ کے جواب میں انوری لکھتا ہے ؎

شعرہائے کمالی آں بہ سخن　　　پائے طبعش سپردہ فرقِ کمال　صـ۶۹۲

(۶) ایک اور شاعر انوری کو اپنے گھر بلاتا ہے

اوحد الدین انوری اے من مرید طبع تو　　　وے ہوائے عشق و مہرِ تو مراد طبع من

ہم بہ بینیم دولتِ وصل تو اندر ربع خویش　　گر محلِّ دولت و اقبال گردد ربع من　ص۱۵۰

(۷) ایک اور شاعر جس کا نام معلوم نہ ہو سکا انوری کی مدح میں قصیدہ لکھتا ہے

اے در ہنر مقدّم اعیانِ روزگار　　در نظم و نثر اخطل و حسّانِ روزگار

آسان بر نفاذِ تو دشوار اختران　　پیداست بر ضمیرِ تو پنہانِ روزگار

حلم ترا کمانہ ہمی کرد ناگہاں　　بگسست ہر دو پلّۂ میزانِ روزگار

اخلاقِ تو سواد ہمی کرد لطفِ تو　　پُر شد بیان دفتر و دیوان روزگار

با عقل ترساں ترساں گفتم کہ در ثنا　　آنرا کہ ہست دیدۂ اعیانِ روزگار

لقمانِ روزگارش خوانم چہ گفت نے　　جز انوری کہ زیبد لقمانِ روزگار　ص۱۵۵

(۸) ایک اور شاعر لکھتا ہے ؎

فرخندہ اوحدالدین فرزانہ انوری　　اے آنکہ از دو عالم وحدت منورست

(۹) سراجی شاعر ترمذی کے خط کے جواب میں انوری کہتا ہے ؎

سراجی اے ز مقیمانِ حضرت ترمذ　　رسید نامۂ تو ہمچو نامۂ زبہشت　ص۶۶۳

(۱۰) ایک وزیر دربار سے اُٹھکر اپنے محل کی طرف جارہا تھا دامن پانو میں الجھا گر پڑا۔ انوری نے اس موقعے پر ایک قطعہ لکھکر بھیجا جس کا ابتدائی شعر ہے

صاحبا سقطۂ مبارک تو　　نہ ز آسیب حادثات رسید　ص۶۳۸

وزیر قطعہ کا جواب قطعہ میں دیتا ہے میں ابتدائی شعر پر قناعت کرتا ہوں ؎

گرچہ شب سقطۂ من ہر کہ دید　　پارۂ از روز قیامت شمرد　ص۶۶۹

کلیات سے بعض ایسے واقعات معلوم ہوتے ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انوری نے زمانہ کو اپنا دشمن بنانے کے بجائے ایسی کوشش بھی کی ہے کہ دشمنوں کو دوست بنایا جائے۔

فتوحی مروزی اس کا سخت ترین معاند مانا گیا ہے لیکن انوری اس کی طرف بھی اپنی دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے لئے طیار رہے۔ چنانچہ کسی دوست کو لکھتا ہے ؎

آدم باغمے کہ جان ببرد گر ز لطفِ تو غمگسار آید گر فتوحی ز دوستدارِ تو بندہ را نیز دوستدار آید
یا بنزدیکِ او و روم روزے کہ بروزیم یک دو بار آید ص ۶۴۸

کسی اور موقعے پر شاعر اپنے کسی دشمن کی سفارش میں جس نے اس کو نقصان پہنچایا ہے کہتا ہے۔

اے جواں بخت سروے کہ ندید چوں تو فرزانہ چشم عالم پیر بندہ را خصم اگر بہ پیش تو کرد نقش عنوان نامہ تزویر
مالش آں بس کہ تا بحشر بماند بگنہ مست شربتِ تشویر مبر امیدش از عطائے بزرگ اے بزرگ جہاں بجرم حقیر
زانکہ جزو ست جود تو تنگ شد پائے ظلم و نیاز در زنجیر مادرے پیر دارد و دو سہ طفل از جہان نفور جفت نفیر
ہمہ گریاں لقمہ از امید ہمہ عریان جامہ از تدبیر غم دل کردہ بر رخ ہر یک صورتِ حال ہر یکے تصویر
دست اقبالت ار نہ بکشاید بند ادبار ایں معیل فقیر گاو دو شائے عمر او ندہد زیں پس از خشک سال حادثہ شیر (ص ۱۵۴)

انوری کا اگر زمانہ دشمن ہوتا تو اس کو کیا ضرورت تھی کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ اس قدر فیاض جذبات کا اظہار کرتا۔ مولانا شبلی کی افراط و تفریط استعجاب انگیز ہے کبھی تو انوری کو ایسا بلند پایہ مانتے ہیں کہ سنجر جیسا جلیل القدر سلطان دو مرتبہ اس کے گھر جاتا ہے اور جب ناراض ہوتے ہیں تو اتنا کم ظرف اور بدحوصلہ بتاتے ہیں کہ تمام دنیا کو اس کا دشمن بنا دیتے ہیں۔

قولہ " سلطان علاء الدین ملک الجبال سے لوگوں نے شکایت کی کہ انوری نے حضور کی ہجو لکھی ہے سلطان نے ملک طوطی کو جو مرو شاہجہاں کا رئیس تھا، خط لکھا کہ انوری کو گرفتار کرکے دربار میں بھیج دو۔ ملک طوطی نے فخر الدین مروزی کو جو اس کے دربار کا شاعر اور منشی تھا حکم دیا کہ انوری کو لکھو کہ میں آپ کے ملنے کا مشتاق ہوں۔ فخر الدین مروزی انوری کا بڑا دوست تھا اس نے انوری کو اصل حال سے مطلع کرنا چاہا، لیکن ملک طوطی کے ڈر سے صاف صاف نہیں لکھ سکتا تھا، اس لئے خط کے سرنامہ پر یہ شعر لکھا۔

ھی الدنیا تقول بملاء فیھا حذارِ حذار من بطشی وفتکی

انوری سمجھا کہ کچھ بھید ہے، تحقیق سے اصل واقعہ معلوم ہوا ''

(شعر العجم ص ۲۷)

مولانا شبلی اس موقعے پر پہلی مرتبہ محمد عوفی کی لباب الالباب کا حوالہ دیتے ہیں لیکن میرا عقیدہ ہے کہ یہ کتاب اُسوقت تک ان کی نظر سے نہیں گزری تھی اس لئے کہ شبلی فخرالدین مروزی کو ملک طوطی کے دربار کا شاعر اور منشی بیان کرتے ہیں جو ملک طوطی کے خوف سے انوری کو اصل واقعے سے اطلاع نہیں دے سکتا حالانکہ لباب سے کوئی ایسا مفہوم ظاہر نہیں ہوتا بلکہ یہ قیاس میں آتا ہے کہ خود علاء الدین کے دربار سے اس کا تعلق تھا۔ اس موقعے پر لباب کی عبارت ہے:

"بنزدیک ملک طوطی نبشت تا آں بلبل بستان فصاحت را بخدمت او فرستد و لطف مجاملت درمیان آورد و چناں می نمود کہ او را بجہت تعہد و تلطف استدعا می کند و در ضمیر داشت کہ چوں بر وے دست یابد او را نکال گرداند و امیر عمید فخرالدین را ازاں حال علم بود و صورت حال بنزدیک اوی توانست نبشت چہ از سطوت قہر سلطاں علاء الدین می اندیشید و مصادقت و دوستی باہمال رضا نمی داد" (لباب الالباب جلد دوم ص ۱۳۵)

ملک طوطی مرو شاہجہاں کا رئیس نہیں ہے بلکہ قبائل غز کا سردار۔ سنجر کے دربار میں غزوں کے دو ایلچی رہا کرتے تھے ایک کا نام قرغود تھا اور دوسرے کا طوطی۔ جب ۵۴۸ھ میں ان قبائل نے سنجر کو شکست دے کر اور اسیر کرکے تمام خراسان پر قبضہ کرلیا تو میاں طوطی کا طوطی خوب بولنے لگا اور طوطی سے ملک طوطی بن گئے۔ انوری جو غزوں سے دلی نفرت رکھتا تھا شومی قسمت سے غز انقلاب کے دور میں کچھ عرصہ کے لئے ملک طوطی کے دربار میں توسل پیدا کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور بضرورت وقت اس کے مدح و ثنا میں نظمیں بھی لکھتا ہے لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ تعریفوں میں در پردہ تعریض مقصود ہے مثلاً یہ شعر

طوطی اے آنکہ ز انصاف تو ہر نیم شبے — بلبل شکر بعیّوق برد زمزمہ را

دیکھو شاعر طوطی کے لئے بلبل سے آیا اور یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

خسرو صاحبقراں طوطی کہ از انصاف او — باز را تیہو ہوا خواہ است و شاہیں را حمام ص ۲۶۷

شاعر نے پرندوں کا ضلع نہیں چھوڑا اور ذیل کی رباعی میں تو پورا چڑیا خانہ بھر دیا ہے۔ رباعی

اے زیر ہمائے ہمتت چرخ مدام — کبک از نظرت گرفتہ با باز آرام

اقبالِ تو شاہین و کبوتر ایّام   سیمرغ نظیر خسرو طوطی نام   ص۵۴۰

دیوان میں اگرچہ غوریوں کے متعلق کئی تلمیحات ملتی ہیں لیکن کوئی نظم ایسی موجود نہیں جس کو علاء الدین کی ہجو کے نام سے موسوم کیا جا سکے البتہ ایک شعر ایسا ہے جو علاء الدین کی ناراضی کے اسباب پیدا کر سکتا ہے۔

کہ لسبو راخ غور کین تو در   بمثل موش بادہ شیر نر است   ص۸۸

قولہ " انوری کے مخالف شعرانے اب یہ طریقہ اختیار کیا کہ خود ہجویں لکھکر اس کے نام سے مشہور کرتے تھے اور انوری کو اس کا خمیازہ اُٹھانا پڑتا تھا چنانچہ جب وہ بلخ میں آیا تو فتوحی شاعر نے حکیم سوزنی کی فرمائش سے بلخ کی ہجو لکھی اور انوری کے نام سے مشہور کر دی، اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

چار شہر ست خراساں را بر چار طرف   کہ وسط شاں بہ مسافت کم صد در صد نیست

گرچہ معمور و خرابش ہمہ مردم دارد   نہ چناں ہست کہ آبستن دام و دد نیست

بلخ را عیب اگر چند باوباش کنند   بر بہر بے خردی نیست کہ صد بخرد نیست

مصر جامع را چارہ نہ بود از بد و نیک   معدنِ زر و گہر بے سرب و بسنّد نیست

حبذا شہر نشاپور کہ در ملک خدائے   گر بہشت ست ہمین ست و گرنہ خود نیست

اہل شہر اس پر اس قدر برہم ہوئے کہ انوری کو پکڑ کر تختہ کلاہ کیا اور اوڑھنی اُڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی، اس سے بھی زیادہ نوبت پہنچتی لیکن قاضی حمید الدین جن کی تصنیف سے مقاماتِ حمیدی ہے اور جن کی شان میں انوری نے کہا ہے ؎

بمدح و ثنا گر گنی رائے نظمے   نہ دشوار گویم نہ آساں فرستم

ولیکن بہ مدحِ جناب حمیدی   اگر وحی باشد ہراساں فرستم

انھوں نے انوری کی حمایت کی اور اُسکی جان بچ گئی، انوری نے ان واقعات کا اس قصیدے میں ذکر کیا ہے ع   اے مسلماناں فغاں از دورِ چرخِ چنبری

یوں لہ انوری کے بچانے میں ابو طالب نعیم، صفی الدین عمر، مفتی تاج الدین، حسن محتسب
نظام الدین احمد مدرس نے بھی کوشش کی تھی، اس لئے قصیدے میں سب کا ذکر کیا ہے
اور بلخ کی ہجو سے نہایت تبری کی ہے کہ بلخ قبۃ الاسلام ہے میں اس کی ہجو کیوں کر
کہہ سکتا ہوں" (شعر العجم صفحہ ۲۰۲ و ۲۷۰)

ہجو بلخ کے اصل واقعات، ایسا معلوم ہوتا ہے، ہم تک نہیں پہنچے ہیں۔ تذکرہ نگاروں کا ماخذ غالباً وہی قصیدہ ہے جو سوگندنامہ در باب نفی ہجو بلخ کے نام سے مشہور ہے میں بھی ان واقعات کے مطالعے کے وقت اسی سوگندنامہ سے کام لوں گا۔

سنجر کی وفات کے بعد جب خراسان میں انقلاب پر انقلاب آرہے تھے اور آئے دن حکمراں بدل رہے تھے انوری بلخ میں سکونت اختیار کر چکا تھا۔ ان دنوں طغرل تگین کا عہد حکومت تھا جیسا کہ شاعر سوگندنامہ کے مقطع میں کہتا ہے۔

حبذا تاریخ این انشا کہ فرمانده به بلخ   رایت طغرل تگیں بوده است و رائے ناصری صفحہ ۴۰۴

اس فرمانده کے حالات سے ہم تاریکی میں ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا زمانہ سنجر کے بعد ہے۔
چنانچہ انوری ؎

ملک اگر در دولتِ سنجر بآخر پیر گشت   شد جواں بار دگر در دولت طغرل تگیں صفحہ ۳۲۳

علیٰ ہذا ہجو بلخ کے واقعے کی تاریخ سے ہم ناواقف ہیں۔ بالعموم یہی خیال کیا گیا ہے کہ یہ واقعہ انوری کے آخر حصۂ عمر سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کے بعد وہ عزلت نشین ہو جاتا ہے۔ پروفیسر براؤن اور میرزا محمد قزوینی اس واقعہ کا ظہور انوری کی پیشین گوئی کے غلط ثابت ہونے کی پاداش میں بتاتے ہیں لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ وہ انوری کی عزلت گزینی سے بہت عرصہ پیشتر ظہور میں آیا ہے۔ انوری کی تشہیر سلطان سنجر المتوفی ۵۵۲ھ اور قاضی حمید الدین المتوفی ۵۵۹ھ کے سنین وفات کے درمیان کسی وقت عمل میں آئی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ قاضی حمید الدین شاعر کو بلخیوں کے ہاتھ سے نجات دلواتے ہیں۔

ہجو کے اصلی مصنف کے نام سے ہم ناواقف ہیں۔ سوگندنامہ میں صرف "حسود" کے لفظ سے یاد

کیا گیا ہے **شعر**

بازداں آخر کلام من زمنحول حسود   فرق کن نقش الٰہی را زنقش آذری ص ۴۰۱

اور ہمارے شاعر کے ساتھ اس کی عداوت دس سال سے چلی آ رہی ہے

تا تو فرصت جوے گردی و زکمیں گاہ حسد   غصۂ دہ سالہ را با من بصحرا آوری ص ۴۰۲

ہجو کا مصنف خواہ کوئی ہو حکیم انوری کے بیان سے صاف پایا جاتا ہے کہ صاحب "خرنامہ" نے جو بقول شادی آبادی حکیم سوزنی ہے اس کی ہجو کی ہے۔ سوگندنامہ **شعر**

چوں مرا و را واضع خرنامہ گیرد ریش گاو   گاو در خرمن من باشد از ... خری ص ۴۰۲

ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ "ہجو بلخ" کوئی اور چیز ہے اور "خرنامہ" کوئی اور چیز ہے اور وہ نظم جس سے بلخی ناراض ہوتے ہیں ہجو بلخ ہے نہ خرنامہ۔ شادی آبادی نے حکیم سوزنی کے کلیات سے خرنامہ کے چند اشعار نقل کئے ہیں چونکہ موجودہ مذاق کے معیار سے پست ہیں لہذا قلم انداز کئے جاتے ہیں صرف وزن و ردیف کی خاطر ایک شعر یہاں لکھ دیا جاتا ہے ؎

آں سر خراں بجائے نماید سر خری   پر مغز خر شود ہمہ دیوان دفترم

شادی آبادی سوزنی کے دیوان سے امیر معزی کی ہجو کے بعض اشعار نقل کر کے یہ غلط نتیجہ مترتب کرتے ہیں کہ ہجو بلخ کا واضع خود امیر معزی تھا لیکن امیر معزی ۵۴۲ھ میں وفات پاتا ہے۔ اثیر الدین فتوحی ان ایام میں زندہ تھا اور انوری سے اس کی مخالفت کا راز بھی طشت از بام ہے اسی لئے تذکرہ نگاروں نے ہجو کا قرعہ اس کے نام پر ڈالا ہے۔

آمدم برسر قصہ، ہجو کا خمیازہ بے گناہ انوری کو اٹھانا پڑا تفصیلی واقعات کسی کو معلوم نہیں سوگندنامہ میں شاعر نے اس قدر کہا ہے **بیت**

بر سر من مغفری کرد کلہ واں بر گزشت   بگزرد بر طیلسانم نیز دو رمعجری ص ۳۹۹

اس شعر کی ترجمانی میں اہل تذکرہ نے قیاس دوڑایا ہے کہ بلخیوں نے انوری کو تختہ کلاہ کیا اور عورتوں کی اوڑھنی اڑھا کر گلی کوچوں میں تشہیر کی۔ شادی آبادی کہتے ہیں کہ امیر معزی کی شکایت پر یہ تشہیر پادشاہ عہد کے حکم سے

وقوع میں آئی۔

لیکن ایک اور قصیدے سے جو مجدالدین کی مدح میں ہے اور جس کا مطلع ہے:۔

اکنوں کہ ماہ روزہ بنقصان دراوفتاد — آہ از حجاب حجرۂ دل بردرا وفتاد ص۹۷

اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ رمضان میں ہوا تھا۔ غوغائی اس کے گھر پر چڑھ آئے تھے اور اس کی تخویف و توہین وہیں عمل میں آئی تھی۔ شاعر مجدالدین کو خطاب کر کے کہتا ہے ؎

الحق محال نیست کہ بندہ چو دیگراں — از عشق خدمت تو بدیں کشورا وفتاد

اوراکہ شکرہائے شکر ریز شعرہاست — زہرے بدست واقعہ در شکرا وفتاد

از حضرتے حشر بدرش حاضر آمدند — نادیدہ مرگ در فزع محشرا وفتاد

تیمارش از تعرضِ ہر بے خبر فزود — دستارش از عقیلۂ صد معجرا وفتاد

بشنو کہ در عذاب چگونہ رسید صبر — بنگر کہ در خلاب چگونہ خرا وفتاد

با منکرانِ عقل دریں خطہ کار او — داند ہمی خدائے کہ بس منکرا وفتاد

کافور در غذاش با فطار ہر شبے — از جور او (؟) بمومن و بر کافرا وفتاد

از بس کہ بار داوری این و آں کشید — اور اسخن بحضرتِ ایں داورا وفتاد ص۹۸

اس ورطۂ بلا سے جن لوگوں نے انوری کو نجات دلوائی ہم ان کے ناموں سے مطلق بے خبر ہیں۔ سوگندنامہ میں جن بزرگوں کا نام بسبیل تذکرہ آیا ہے اس سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ وہ اس کے نجات دہندہ ہیں۔ شاعر کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ جب بلخ میں ایسے ایسے مشاہیر فضلا و علما جمع ہیں ان کی موجودگی میں بھلا میری کیا مجال ہو سکتی ہے کہ بلخ کی ہجو کا خیال دل میں بھی لا سکوں اس کے متعلق سوگندنامہ کے بیانات بالکل صاف ہیں۔

باچنیں سکّاں اگر از قدرِ شاں عقدے کشند — فارغ آید چرخ اعظم از چہ از بے زیوری

ہجو گویم بلخ را ہیہات یارب زینہار — خود تواں گفتن کہ زنگارست زر جعفری ص۴۰۱

ان بزرگوں میں سب سے مقدم نظام الدین ہیں۔ شبلی ان کو نظام الدین احمد مدرس کہتے ہیں لیکن ان کا پایہ اس سے بدرجہا افضل و ارفع معلوم ہوتا ہے۔ شادی آبادی ان کو ضابط بلخ کہتے ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ

قاضی القضاۃ ہیں۔ سوگندنامہ

افتخار خاندان مصطفیٰ در بلخ و من کردہ ام در خدمتش حسانی وہم بوتری

آں نظام دولت و دیں کا نظام عدل او در دل اعصاں کند باد صبا را رہبری

در پناہ سدۂ جاہ رعیت پرورش بر عقاب آسماں وزاں دہد کبک دری

ہم نبوت در نسب ہم پادشاہی در حسب کو سلیماں تا در انگشتش کند انگشتری

مسند اقضی القضاۃ شرق و غرب افراشتہ آں کہ ہست از مسندش عباسیاں را برتری

آنکہ پیش کلک و طبعش آں دو سحر آنکہ حلال صد چو من ہستند چوں گوسالہ پیش سامری

آب و آتش را اگر در مجلسش حاضر کنند از میان ہر دو بردارد شکوہش داوری صـ۴۰۲

قاضی حمید الدین کے ذکر کے بعد انوری خواجہ صفی الدین عمر کا ذکر کرتا ہے۔ شعر العجم میں انھیں "صفی الدین عم" کہا گیا ہے لیکن سوگندنامہ:

خواجۂ ملت صفی الدین عمر در صدر شرع آنکہ نبود دیو را در سایۂ او قادری صـ۴۰۲

کلیات میں ان کی تعریف میں ایک اور قصیدہ موجود ہے جس کا مطلع ہے:

زمانہ گذراں بس حقیر و مختصر است ازیں زمانۂ دوں در گزر کہ در گزرست صـ۵۲

تاج الدین کے بعد مجد الدین ابو طالب کا نام آتا ہے غالباً یہ وہی بزرگ ہیں جن کے مدحیہ قصیدے سے چند اشعار اوپر درج ہوئے ہیں۔ شبلی ان کو ابو طالب نعیم کہتے ہیں سوگندنامہ:

مجد دیں بو طالب آں عالم کرہ گم شد درو (کذا) عقل کل آں کردہ از بیرون عالم اطہری صـ۴۰۱

شعر العجم میں ایک اور نام ملتا ہے "حسن محتسب" مگر سوگندنامہ اس سے واقف نہیں ہے۔

قولہ " بالآخر انوری نے تمام لغویات سے توبہ کی اور گوشہ گزیں ہو کر بیٹھا، سلطان غوری جہانسوز نے دربار میں طلب کیا، لیکن اس نے انکار کیا اور یہ قطعہ جواب میں لکھا۔

کلبۂ کاندرو بروز بہ شب جائے آرام و خورد و خواب منست
جایگہ دارم اندرو کہ ازو چرخ در عین رشک و تاب منست
ہر چہ در مجلس ملوک بود ہمہ در کلبۂ خراب منست
رحل اجزا، و نان خشک درد گرد خوان من و کباب منست

قلم کوتہ و صریر خوشش | زخمہ و نغمۂ رباب من ست | خرقۂ صوفیانہ اطلس | از ہزار اطلس انتخاب من ست
ہر چہ بیروں بود ازیں کم و بیش | حاش للسامعین عذاب من ست | خدمت پادشہ کہ باقی باد | نہ بباز وے آب و خاک من ست
زیں قدر راہ رجعتم بستہ است | آں کہ او مرجع و مآب من ست | ویں طریق از نمایش ست خطا | حکمم ایں خطا صواب من ست
نیست ایں بندہ را زبانِ جواب | جامہ و جائے من جواب من ست | | شعر العجم ص ۲۰۲

علاء الدین غوری کی طلب کا واقعہ صحیح نہیں مانا جاسکتا کیونکہ بروایت مشہور علاء الدین انوری سے صاف نہیں تھا۔ دوسرے یہ امر بھی خاطر نشیں رہے کہ اگرچہ انوری کی گوشہ نشینی کا سال ہم کو معلوم نہیں لیکن کلیات سے اس قدر قطعی پایا جاتا ہے کہ حکیم انوری ۵۶۱ھ میں سلطان عماد الدین پیروز شاہ کے پاس ترمذ جاتا ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ اس سن سے ایک عرصہ بعد تک وہ مدح سرائی اور شعر گوئی سے تائب نہیں ہوتا۔ کیونکہ کلیات میں متعدد قصائد اسی پیروز شاہ کی مدح و ثنا میں ملتے ہیں جو غالباً کئی سال کے عرصہ میں لکھے گئے ہونگے۔ لیکن علاء الدین غوری جہاں سوز ۵۵۶ھ میں وفات پاتا ہے اس لئے انوری کی عزلت نشینی کے زمانے تک اس کا زندہ رہنا ناممکن ہے۔

قطعۂ بالا میں انوری جس بادشاہ کی خدمت سے دستکش ہوتا دیکھا جاتا ہے وہ کوئی اور بادشاہ ہے جس سے اس کے گہرے اور دیرینہ تعلقات معلوم ہوتے ہیں اور جس کے دربار میں وہ عرصہ تک رہ چکا ہے کیونکہ یہ طلبی کی تحریک ایک عرصہ تک جاری رہی ہے اور کئی قطعات اس سلسلہ میں لکھے گئے ہیں۔ ذیل میں انوری کا آخری جواب اور بادشاہ کی طرف سے اس کا جواب الجواب جس پر یہ تحریک ختم ہو جاتی ہے درج کئے جاتے ہیں:۔

خسروا روزے زعمرم گر سپہر افزوں کند | تا نگیر دل بستہ مرگم چوں مگس را عنکبوت
گر توانم سجدہ گاہ شکر سازم ساحتش | چوں مسیح مریم از صفر حمل تا پائے حوت
پس چگوئی صرف یارم کرد بر درگاہ تو | ہر یکے زیں روزہا را از پئے یک روزہ قوت
طالب مقصود را یک سمت باید مستوی | مرد را سرگشتہ دارد اختلافات سموت
من چو کرم پیلہ ام قانع بیک نوع از غذا | تو اماں با صبر چوں و تر ضیقی با قنوت | ص ۶۲۶

بادشاہ بھی اسی زمین میں جواب دیتا ہے لیکن وزن مثمن کے بجائے مسدس ہے۔

اے بتو مخصوص اعجازِ سخن | چوں بوتر آئی و در معنی قنوت

سمت درگاہت سعود چرخ را	گشتہ در دوراں گل خیر السموت
ماچو قرص ارزن وحوت غدیر	تو چو قرص آفتاب و برج حوت
صعوۂ ما مرغِ سیمرغ تو نیست	تو قوی بازو بفضل و ما بقوت
بیش نظم چوں نسیج الوحد تو	چیست نظمِ ما نسیج العنکبوت
گرچہ در تالیف ایں ابیات نیست	بے سمیں غثے و قصبے بے کروت
راے عالی درجوابِ ایں مبند	لایق اینجا السکوت ست السکوت ص ۵۹۵

قولہ " انوری نے حسب روایت دولت شاہ ۵۴۷ھ میں بمقام بلخ وفات پائی اور سلطان احمد خضرویہ کے پہلو میں دفن ہوا " شعر العجم ص ۲۷۳

انوری کی وفات میں سخت اختلاف ہے پروفیسر براون پروفیسر ژوکوفسکی کے حوالے سے یہ تاریخیں دیتے ہیں۔ آتش کدہ قلمی ۵۵۶ھ اور طبع بمبئی ۵۵۹ھ تقویم التواریخ حاجی خلیفہ ۵۴۷ھ، مرات الخیال شیر خاں لودھی ۵۴۹ھ، ہفت اقلیم ۵۸۰ھ، مجمل فصیحی ۵۸۵ھ، خلاصۃ الاشعار تقی کاشی ۵۸۰ھ اور مرات العالم ۵۹۲ھ۔

دولت شاہ نے جو تاریخ دی ہے ہر صورت میں غلط ہے چونکہ طوفان باد کے سلسلہ میں انوری کا نام بھی لیا جاتا ہے اور طوفان کی تاریخ ۵۸۲ھ ہے اس لئے انوری کی وفات اس سن کے بعد کسی وقت ماننا ہوگی۔

حمد اللہ مستوفی نزہت القلوب میں انوری کا مزار سرخاب، تبریز میں جہاں خاقانی اور ظہیر فاریابی وغیرہم دفن ہیں بتاتا ہے اور یہ کیسی قدر حیرت خیز ضرور ہے اس لئے کہ شاعر کا اکثر حصۂ عمر بلخ میں بسر ہوا ہے۔ اور آخر عمر میں تبریز جا کر کیا کرتا۔

قولہ " انوری کا اصلی مایۂ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو گوئی کوئی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا، ہجو میں اس نے نہایت اچھوتے، نادر، باریک اور لطیف مضامین پیدا کئے ہیں، ان ہجووں میں قوت تخیل جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے صاف نظر آتی ہے، لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ اس صنف میں اس کا

جو کلام زیادہ نادر ہے، اسی قدر زیادہ فحش ہے، سیکڑوں اشعار ہیں لیکن (دو ایک کے سوا) ایک بھی درج کے قابل نہیں، کسی کو ایسا ہی شوق ہو تو آتش کدۂ آذر موجود ہے ہم اپنے دست و قلم کو اس سے آلودہ نہیں کر سکتے، ایک آدھ ہجو فحش سے خالی بھی ہے، وہ حاضر ہے۔

پہلے ایک شخص کی مدح لکھی پھر صلے کا تقاضا کیا، اس کے بعد ہجو کی دھمکی دی، دیکھو کس لطیف طریقے سے ادا کیا ہے۔

سہ بیت رسم بود شاعرانِ طامع را   یکے مدیح و دگر قطعۂ تقاضائی

اگر بداد سوم شکر، ورنہ داد ہجا   ازیں سہ بیت دو گفتم دگر چہ فرمائی،،

شعر العجم صـ ۲۸۳

انوری کی شاعری کے کئی پہلو ہیں مثلاً اوصاف نگاری یا مدّاحی، اخلاقیات و پند و حکم اور مہاجات اپنے ہم وطنوں میں انوری اپنے کمال قصیدہ نگاری کی بنا پر فردوسی اور سعدی جیسے شہسواران فن کا ہمعنان مانا گیا ہے۔ مولانا شبلی برخلاف مذہب جمہور اس کو ہجو گوئی کی نبوت کا منصب عطا فرماتے ہیں اور اس کے حقیقی کمال کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے نہ انھوں نے قصیدہ گوئی کی اہم دقائق، مشکلات اور اس کی پیچیدگیوں کی داد دی ہے۔

مولانا نے انوری کا کلیات بچشم خود نہیں دیکھا ہے۔ محض اُس انتخاب کی بنا پر جو صاحب آتش کدہ نے انوری کے کلام کا دیا ہے یہ حکم صادر فرمایا ہے کہ انوری کا کلام جس قدر نادر ہے اسی قدر زیادہ فحش ہے سیکڑوں اشعار ہیں لیکن ایک بھی درج کے قابل نہیں۔ اب اگر صاحب آتش کدہ نے انوری کے کلام سے زیادہ تر ایسا نمونہ پیش کیا جو مولانا کے نزدیک مردود و مطرود ہے تو یہ صاحب آتش کدہ کی بد مذاقی کا قصور ہے جس نے زیادہ تر ایسا کلام پسند کیا یا خود مولانا شبلی کا جنھوں نے محض آذر کے انتخاب کی بنا پر ایک غیر موجّہ اور عاجلانہ فیصلہ دے دیا جو حقیقت اور واقعیت سے کوسوں دُور ہے۔ ہمیں انوری کا کلام خود دیکھنا چاہیے وہ ابھی تک بازار میں دستیاب ہوتا ہے۔

کلیات میں ہر قسم کا ذخیرہ موجود ہے جس سے ہر مذاق کا شخص اپنے اپنے مطلب کے پھول چن سکتا ہے
اس چمنستان میں جہاں ہجو اور فحش کے خار ہیں وہاں متین اور سنجیدہ کلام کے گل و ریاحین کثرت کے ساتھ نظر آتے
ہیں البتہ کانٹوں کی اس قدر بہتات نہیں ہے جس کے مولانا شبلی مدعی ہیں اور یہ خیال تو قطعی غلط ہے کہ
اس کا کلام جس قدر زیادہ نادر ہے اسی قدر زیادہ فحش ہے۔ انوری کی فحش گوئی صرف چند عریاں اور قابل اعتراض
الفاظ کے استعمال پر منحصر ہے۔ دشنام دہی میں کسی لطافت خیال اور دقتِ نظر کی ضرورت نہیں ہوتی۔
اس لئے اس صنفِ سخن میں شاعر کی قوت تخیل کے کارناموں کی تلاش کرنا میرے خیال میں بے سود ہے
انوری کی اوصاف نگاری سے قطع نظر کرنا اس کی فحش نگاری کی تعریف کرنا۔ اس کے اخلاقیات کو پس پشت
ڈال دینا اور اس کی ہجویات کو اچھالنا ایک ایسی عجیب تحسین ہے جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں گزری۔

بجوں غلطیدہ دست و تیغِ غازی ماندہ بے تحسیں   تو اول زیب اسپ و زینتِ برگستواں بینی

ہجو کی مثال میں جو قطعہ مولانا شبلی نے نقل کیا ہے اور جس کو میں اوپر درج کر آیا ہوں ناظرین انداز
کر سکتے ہیں کہ اس کو ہجو سے کس قدر حقیقی بُعد ہے اس اچھے خاصے قطعہ پر یہ کلنگ کا ٹیکا ناحق لگایا گیا ہے
اگر اس قسم کی لطیفہ سنجی ہجو میں داخل کر لی گئی تو میرے خیال میں مولانا کی ثقاہت کے اعلیٰ معیار تک کوئی
مشرقی اور مغربی شاعر نہیں پہنچ سکتا اور ظرافت و خوش طبعی کا وجود جس کے ایرانی شعرا بالعموم شیدا
نظر آتے ہیں شجر ممنوعہ قرار پاتا ہے۔

ذیل میں اسی ذخیرہ سے جس کو مولانا شبلی رد کر چکے ہیں ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے چند مثالیں
جو مذاقِ حال کی رو سے قابل اعتراض نہیں پیش کی جاتی ہیں۔

جن ایام میں انوری سرخس میں مقیم تھا وہاں ابو علی آبی نام کا ایک عہدہ دار رہا کرتا تھا بعض نامعلوم
اسباب کی بنا پر شاعر اس سے ناراض ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابو علی آبی کی ناک اس کے منہ پر بے جا
تناسب کثیر الحجم واقع ہوئی تھی اور تمام چہرہ پر چھا گئی تھی۔ انوری اس شاندار ناک کی تعریف میں اپنے خیر
ذیل کی رباعی میں دیتا ہے رباعی

با بو علی آبی ار بہم بہ نشینی   شخصے بینی شش جہتش زو بینی

گردیده بدین رخش چار کتی　　چنداں کہ از و بینی بینی

ایک مرتبہ سرخس میں امساک باراں ہوگیا اور بارش دیر میں ہوئی۔ انوری نے آبی اور بے آبی کے انضمام سے یہ لطیفہ حاصل کیا ؎

سرخس از رنج بے آبی و آبی　　دریغا روئے دارد در خرابی
زبے آبی خلاصی یافت امسال　　خداوندا خلاصش دہ ز آبی

یعنی سرخس بے آبی اور آبی کے ہاتھوں برباد ہو رہا تھا۔ اس سال بے آبی سے اس کو نجات مل گئی الٰہی اس کو آبی سے بھی پاک کر

خواجہ ابو الفتح کے بخل کی تشہیر ؎

خواجہ بو الفتح از کمال حرص و بخل　　سیم حاصل می کند بے فائدہ
وز پئے نانے ہمی گوید نشش　　ربنا انزل علینا مائدہ　ص ۵۸۱

ممدوح کو جس سے صلہ حاصل کرنے میں شاعر مایوس ہو چکا ہے یوں خطاب کرتا ہے۔

خداوندا ہمی دانم کہ چیزے نیست در دستت　　گرم چیزے ندادستی بدیں تقصیر معذوری
ولیکن گر کسے پرسد چہ دادستت روا داری　　کہ گویم عشوہ اول روز و آخر روز دستوری　ص ۷۵۵

اگر آپ نے مجھے کچھ عطا نہ کیا تو معذور ہیں اس لئے کہ آپ کے پاس دینے کو کچھ نہیں لیکن جب لوگ مجھ سے پوچھیں تو کہئے کیا کہوں؟ کیا یہی کہ صبح کو فریب دیا اور شام کو رخصت دی۔

نجیب مشرف اور فرید عارض ؛

چہ خیر باشد در لشکرے کہ نیز درو　　نجیب مشرف و عارض فرید لنگ بود
شکست پائے یکے، زو دیا کہ دیگر　　خبر کہ دست دگر نیز زیر سنگ بود　ص ۶۷۵

ایک قرآن خواں قاری کی قرأت انوری کے لئے ناخوشنودی کا اسباب پیدا کرتی ہے اور شاعر اپنی ناراضی کا اظہار ذیل کے ابیات میں کرتا ہے ؎

دوشش در خواب من پیمبر را　　دیدمش کز امت آزردہ است

گفتمش اے بزرگ چت بودہ است　　طبع پاک تو از چہ پژمردہ است

گفت زیں مقربک ہمی جوشم　　رونق دینِ ایزدی بردہ است

آنچہ ایں زن بمزد می خواند　　جبرئیل آں بمن نیاوردہ است　　ص ۶۱۲

کسی وزیر کو جس سے انعام کی اُمید میں شاعر یاس سے ہمدوش ہے یہ مشورہ دیا جاتا ہے۔

تو وزیری و منت مدحت گوے　　دستِ من بے عطا روا بینی

شو وزارت بمن سپار و مرا　　مدحتے گوئے تا عطا بینی　　ص ۷۴۹

تم وزیر ہو اور میں تمھارا مدّاح سخت افسوس ہے پھر بھی خالی ہاتھ رہوں۔ اس صورت میں تجویز کرتا ہوں کہ وزارت تم میرے حوالہ کردو اور شاعری میں تمھارے سپرد کردوں پھر تم قصیدے کہنا اور میں انعام دونگا۔

تاج الدین عمزاد جب زیارت بیت اللہ سے واپس آتا ہے انوری اس کے خیر مقدم میں کہتا ہے

عمزاد زحج باز رسیدہ است بنوئی　　با توبرہٗ طاعت و انبان کرامت

انوری کے ہاں ہجو بحیثیت مجموعی اگر دیکھا جائے تو دس بارہ آدمیوں سے زیادہ کی نہیں ملے گی ان میں چار اشخاص ایسے ہیں کہ متعدد موقعوں پر کلیات میں ان کی مذمت ملتی ہے۔ ان بدنصیبوں میں ایک قاضی طوس ہیں، نمبر دوم سدید الدین بیہقی، نمبر سوم تاج الدین عمزاد اور نمبر چہارم کافی ہروی ہیں۔ شاعر کہتا ہے۔

چار کس یابی کہ در ہجو من اند　　گر بجوئی از ثریا تا ثری

قاضی طوس و سدید بیہقی　　تا جک عمزاد و کافی ہری

ص ۷۵۳

قولہ " انوری کے دیوان میں چند ہجویں انوری کے بیوی اور بیٹے کی بھی پائی جاتی ہیں عام لوگوں کا خیال ہے کہ انوری کو ہجو کا ایسا چسکا پڑ گیا تھا کہ بیوی اور بیٹے کو بھی نہ چھوڑ سکا لیکن اور شعرا نے یہ ہجویں لکھکر اس کے دیوان میں داخل کردی ہیں اور چونکہ پبلک اس کی دشمن تھی وہ اسی طرح قائم رہ گئیں "

شعر العجم ص ۲۸۵

میں نہیں سمجھا کہ یہ عام لوگ کون ہیں اگر تذکرہ نگار ہیں تو باوجود متعدد تذکرے دیکھنے کے مجکو اس قسم کا کوئی
پرچا نظر نہیں آیا۔ بعض اشعار سے پایا جاتا ہے کہ انوری نے شادی ہی نہیں کی تھی۔

انوری زن ازاں سبب نہ کند　　کہ مبادا ز نسلش پسر زاید

کسی دوست کو جس نے شادی کے باب میں مشورہ دیا ہے جواب دیتا ہے

بخدائے کہ بے ارادتِ او　　خلق را رنج و شادمانی نیست
کاندریں روزگار زن کردن　　بجز از محض قلتبانی نیست

خطباتِ دتاسی

(مترجمہ جناب نواب مسعود جنگ بہادر ، ناظم تعلیمات ، حیدرآباد دکن)

خطبۂ پنجم

(بتاریخ ۴ر دسمبر ۱۸۵۴ء)

سنسکرت جو قدیم آریاؤں[1] کی زبان تھی ، ہندوستان یعنی سرزمینِ ہفت دریا یا سپتا[1] سِندھو کی (جو ویدوں کا نام ہے) عام زبان کبھی نہ ہونے پائی ۔ ڈراموں (ناٹکوں) میں خاص خاص اشخاص سنسکرت بولتے ہیں ۔ لیکن عورتوں اور عوام کی زبان معمولی بولی ہے جسے پراکرت کہتے ہیں ۔ پراکرت کے معنی ناتراشیدہ بولی کے ہیں ۔ اور سنسکرت کی ضد ہے جس کے معنی شایستہ[2] زبان ہیں ۔ پراکرت جو دلی میں ہمیشہ بولی جاتی تھی جیسا کہ خود اہلِ[3] ہند کا بیان ہے اور جو بھاشا یا بھاکا " یعنی معمولی بولی " کے نام سے موسوم تھی ، آخر سنسکرت پر غالب آگئی اور اُسے " ہندوستان کی زبان " (ہندی) کا نام دیا گیا جو سنسکرت کو کبھی نہیں ملا تھا۔

آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز سے مسلمان ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے آنے شروع ہوئے سب سے بڑھ کر محمود غزنوی نے اس ملک میں ۱۰۰۰ء کے قریب شاندار کامیابیاں حاصل کیں اور اُس وقت سے شہروں میں ہندوستانی بھاکا کے صورت میں تغیر تبدل پیدا ہوا ۔ چودھویں صدی میں تیمورلنگ

---

[1] یعنی پانچ دریا پنجاب کے اور ان کے علاوہ سندھ اور سرسوتی ۔

[2] اِن ناٹکوں سے قبل بدھ لوگوں کی کتابوں اور اشوک کے کتبوں کی زبان ایک قسم کی پراکرت ہے جو اس وقت عام طور پر بولی جاتی تھی ۔

[3] ملاحظہ ہو اصل دیباچۂ باغ و بہار اور دیباچۂ آثار الصنادید جن کا اقتباس آگے دیا گیا ہے ۔

ہندوستان میں آیا۔ اور دہلی پر قبضہ کرکے اس نے ایک زبردست سلطنت کی بنیاد ڈالی جسے بابر نے ۱۵۲۶ء
میں مستحکم طور سے قائم کیا۔ اس وقت ہندوستانی زبان (ہندی) فارسی زبان سے متاثر ہوئی اور فارسی الفاظ
اس میں بکثرت داخل ہو گئے۔ خود فارسی زبان میں بوجہ اسلامی فتح اور مذہب کے بیشمار عربی الفاظ آگئے
تھے۔ اور اس عجیب اختلاط سے موجودہ ہندوستانی سامی اور حامی امواج کی سنگم بن گئی جو لسانی ترکیب
کے لحاظ سے نہایت عجیب وغریب ہے۔ اسی طور سے ہندوستانی اسلامی زبان کی دو قسمیں ہو گئیں۔ ایک
تو شمال کی زبان جو اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ کیونکہ اس نے اردوئے معلیٰ (شاہی چھاونی) میں جنم
لیا تھا۔ دوسرے وسط اور دکن کی جو دکنی کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس طرح دو ہندوستانی بولیاں
پیدا ہوئیں جو اگرچہ ایک دوسری سے مختلف تھیں تاہم ان میں بہت مشابہت تھی۔

ہندوستان کی یہ زبان جسے خاص طور پر ہندوستان کی زبان کہا جاتا ہے۔ ہندی اور اردو بولیوں میں
تقسیم ہو گئی جس کی بنا مذہب پر ہے۔ کیونکہ عام طور پر یوں ہی کہا جاتا ہے کہ ہندی ہندوؤں کی زبان ہے اور اردو
مسلمانوں کی۔ یہ واقعہ اس قدر صحیح اور سچا ہے کہ جن ہندوؤں نے اردو میں انشا پردازی کی ہے انھوں نے
نہ صرف مسلمانوں کی طرز تحریر کی نقل کی ہے بلکہ اسلامی خیالات کو بھی یہاں تک جذب کیا ہے کہ ان کے
اشعار پڑھتے وقت بمشکل اس امر کا یقین ہوتا ہے کہ یہ کسی ہندو کے لکھے ہوئے ہیں۔

عام طور پر ہندی شاعری میں بہ نسبت اردو یا دکھنی شاعری کے زیادہ قوت اور زور پایا جاتا
ہے یہ عربی کی قدیم شاعری سے ملتی جلتی ہے جو انھیں صفات سے ممتاز ہے۔

مدّتِ دراز تک ہندو سنسکرت میں اور مسلمان فارسی میں تصنیف و تالیف کرتے رہے۔ البتہ مشہور
و مقبول گیت معمولی بولیوں میں بولے اور لکھے جاتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ عمدہ عمدہ کتابیں بھی ہندوستانی
بولیوں میں لکھی جانے لگیں جن کی وجہ سے بقول ولسن کے جو ہندوستانی السنہ علوم کے بڑے عالم ہیں۔
ان بولیوں میں خاصا علم ادب پیدا ہو گیا جو بہت دلچسپ ہے۔

اردو کی بحث پر ہمارے ہم عصر سید احمد نے اپنی کتاب آثار الصنادید میں یہ لکھا ہے۔

"ہندوں کے راج میں تو یہاں ہندی بھاشا بولنے چالنے لکھنے پڑھنے میں آتی تھی۔ ۵۸۷ھ ہجری مطابق ۱۱۹۱ء موافق سمت ۱۲۴۸ بکرماجیت کے جب مسلمانوں کی سلطنت نے یہاں قیام پکڑا تو بادشاہی دفتر فارسی ہوگیا مگر زبان رعایا کی وہی بھاشا رہی۔ ۹۶۰ھ ہجری مطابق ۱۴۸۸ء تک بجز شاہی دفتر کے رعایا میں فارسی کا رواج نہیں ہوا۔ اس کے چند روز بعد سلطان سکندر لودھی کے عہد میں سب سے پہلے ہندوؤں میں سے کائستوں نے جو ہمیشہ سے امورات ملکی اور ترتیب دفتر میں مداخلت رکھتے تھے فارسی لکھنا پڑھنا شروع کیا پھر رفتہ رفتہ اور قوموں نے بھی شروع کیا اور فارسی لکھنے پڑھنے کا ہندوؤں میں رواج ہوگیا۔

اگرچہ بابر اور جہانگیر کے عہد تک ہندی بھاشا میں کچھ تغیر و تبدل نہیں ہوا تھا، مسلمان اپنی گفتگو فارسی زبان میں اور ہندو اپنی گفتگو بھاشا میں کیا کرتے تھے۔ پھر جب امیر خسرو نے خلجی بادشاہوں ہی کے زمانہ سے یعنی حضرت مسیح سے تیرہویں صدی میں فارسی زبان میں بھاشا کے لفظ ملانے شروع کئے تھے۔ اور کچھ پہیلیاں اور مکریاں اور نسبتیں ایسی زبان میں کہیں تھیں جس میں اکثر الفاظ بھاشا کے تھے غالب ہے کہ رفتہ رفتہ بھاشا میں جب ہی سے ملاپ شروع ہوا ہو مگر ایسا نہ تھا جس کو جدا زبان کہا جائے۔ جب کہ شاہجہاں بادشاہ نے ۱۰۵۸ھ ہجری مطابق ۱۶۴۸ء عیسوی کے شہر شاہجہاں آباد آباد کیا اور ہر ملک کے لوگوں کا مجمع ہوا، اُس زمانے میں فارسی زبان اور ہندی بھاشا بہت مل گئی۔ اور بعضے فارسی لفظوں اور اکثر بھاشا کے لفظوں میں بہ سبب کثرت استعمال کے تغیر و تبدل ہوگیا۔ غرضکہ لشکر بادشاہی اور اُردو معلی میں ان دونوں زبانوں کی ترکیب سے نئی زبان پیدا ہوگئی۔ اور اسی سبب سے زبان کا اردو نام ہوا، پھر کثرتِ استعمال سے لفظ زبان کا محذوف ہو کر اس زبان کو اُردو کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس زبان کی تہذیب اور آراستگی ہوگئی یہاں تک کہ تخمیناً سنہ ۱۱۰۰ھ ہجری مطابق ۱۶۸۸ء عیسوی کے یعنی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں شعر کہنا شروع ہوا۔

اگرچہ مشہور ہے کہ سب سے پہلے اس زبان میں ولی نے شعر کہا، مگر خود ولی کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس سے پہلے بھی کسی نے اس زبان میں شعر کہا ہے کیوں کہ اس کے شعروں میں اور شاعروں کی زبان پر طنز نکلتی ہے۔ مگر اُس زمانے کے شعر بہت پھیکے اور نہایت سست بندش کے تھے۔ پھر دن بدن

اس کو ترقی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ میر اور سودا نے اس کو کمال پر پہنچا دیا۔

آخر میں جس زمانہ کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، اس سے قبل حاتم اپنے "دیوان زادہ" کے دیباچہ میں لکھتا ہے (یہ تحریر سنہ ۱۷۵۵ء کی ہے)۔

میں نے تحریر کے لئے وہ زبان اختیار کی ہے جو ہندوستان کے تمام صوبوں کی زبان ہے یعنی ہندوی، جسے بھاکا کہتے ہیں، کیونکہ اسے عام لوگ بھی بخوبی سمجھتے ہیں اور بڑے طبقے کے لوگ بھی پسند کرتے تھے"۔

درحقیقت جو کچھ سید احمد نے لکھا ہے وہ سب کا سب بالکل صحیح نہیں ہے۔ اہل مشرق میں یہ خوبی شاذونادر پائی جاتی ہے۔ ان میں تخیل اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ وہ کسی مسئلہ کے ہر پہلو کی تحقیق نہیں کر سکتے۔ سب سے پہلے سید احمد نے یہ کہا ہے کہ مسلمانوں کی فتح کی بعد سے یعنی سنہ ۱۱۹۱ء سے سنہ ۱۶۴۸ء تک ہندوستانیوں کی زبان میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ اس کے برخلاف میر امن[1] یہ کہتے ہیں۔

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئی۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین سودا سلف سوال وجواب کرتے ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی"۔

اس پر کچھ اور بھی اضافہ کرنا پڑے گا۔ گیارہویں صدی کے آخر سے قبل شاید سنہ ۱۱۰۰ء میں مسعود بن سلمان نے ریختی میں دیوان مرتب کیا۔ ریختہ سے مطلب وہی ہے جو سید احمد نے بیان کیا ہے یعنی ہندی جس میں فارسی الفاظ کی آمیزش ہو۔ بالفاظ دیگر اردو۔ علاوہ اس کے بہت سے ہندوستانی تذکرہ نویسوں نے ریختی کے بعض اشعار سعدی سے بھی منسوب کئے ہیں جو دکن میں سنہ ۱۲۵۰ء اور سنہ ۱۲۸۰ء کی درمیان لکھے گئے ہونگے[2]

---

[1] ملاحظہ ہو باغ وبہار کا دیباچہ [2] ہندوستانی تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ سعدی ۱۰۳ سال زندہ رہا (سنہ تولد ۱۱۹۳ء اور سنہ وفات ۱۲۹۶ء) تیس سال تعلیم میں بسر کئے، تیس سال سفر میں اور تیس سال عزلت، تعلیم کے تیس سال میں بچپن کے تیرہ سال جمع کئے جاویں تو ۴۳ سال ہوتے ہیں اس حساب سے سنہ ۱۲۳۶ء اور سنہ ۱۲۶۶ء کے درمیان جب وہ سفر کر رہے تھے اس وقت انھوں نے ریختے کے وہ اشعار لکھے ہونگے جو ان کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔

کمال اپنے دیوان میں سعدی کو موجدِ زبانِ ریختہ کہتا ہے لیکن اس کے بیان کی صحت کے لئے چاہئے کہ "وسط ہند یا دکن میں" کیونکہ سو برس پہلے مسعود ریختی میں نظم لکھ چکا ہے بہرحال یہ اس کے بعد کی بات ہے کہ خسرو اور نوری نے نظمیں لکھیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد پھر وسط ہند میں خاصی بولی جس کا نام دکنی ہے، ریختی میں نظم لکھی گئی اور اس کا اثر شمال کے شاعروں پر بھی ہوا جو اس وقت تک عموماً فارسی میں لکھتے تھے اور وہ بھی معمولی زبان میں نظمیں لکھنے لگے۔ سولھویں صدی میں ہم کئی مشہور دکنی شعرار کا نام دیکھتے ہیں۔ مثلاً شاہانِ گولکنڈہ، قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، ابوالحسن جس کا تخلص تانا ہے۔ ان کے علاوہ افضلؔ دلی، نوری، غواصی، رسمی وغیرہ ہیں۔ حالانکہ شمال میں ہم اٹھارہویں صدی میں بھی بمشکل کسی مشہور ریختہ گو کا نام پاتے ہیں۔ غالباً حاتم جو سترہویں صدی کے آخر میں ہوا ہے، دلی کا پہلا شاعر ہے۔ اس نے حقیقی اُردو میں شاعری کی ہے اور اس نے اعتراف کیا ہے کہ دہلی میں ولی کے دیوان کے پہنچنے کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے اس زبان میں لکھنا چاہئے اور دوسرے شاعروں نے اس کی تقلید کی۔

مشہور گلکرسٹ نے جو انگریزوں میں ہندوستانی کے مطالعہ کا بانی ہوا ہے، ۱۸۲۸ء میں ایک دیسی تذکرہ کا ذکر اپنی صرف و نحو میں کیا ہے اور اس وقت سے مجھے اس زبان کی ادبی تاریخ کا شوق پیدا ہوا۔ میں نے تحقیق و جستجو کے بعد سات دیسی تذکرے بہم پہنچائے اور باوجود ناکافی سامان کے میں نے ۱۸۳۹ء میں ہندوی اور ہندوستانی ادب کی تاریخ شایع کی۔ یہ تالیف اگرچہ بہت ناقص ہے۔ تاہم پہلی کتاب ہے جو اس مضمون پر لکھی گئی ہے اور اس قابل سمجھی گئی کہ ہندوستانی میں بھی اس کا ترجمہ کیا گیا۔ اور اس نے انگریز متشرقین میں بھی شوق پیدا کر دیا۔ میری اور ان کی مشترکانہ تحقیق نے اور بہت سے تذکروں کا پتہ لگایا جن سے میں ابھی پوری طرح کام نہیں لے سکا اس لئے کہ بعض ان میں سے اب تک مجھے نہیں ملے بعض ایسے ہیں کہ جن کا ذکر دیسی تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں میں کیا ہے اور بہت سے ایسے ہیں کہ جن کا ابھی تک علم بھی نہیں ہے۔

یہ امر آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ اس تاریخ کے نئے اڈیشن کے لئے کس قدر نئے سامان کی ضرورت

ہے لیکن میں مختصر طور سے یہ بیان کروں گا کہ اہل ہند کے اِن تذکروں سے ہم شعرا کے حالات اور تصانیف کے متعلق کس قسم کا مواد جمع کر سکتے ہیں۔

ایرانی - اور (اُن کی تقلید میں) ہندوستانی مسلمان تذکرہ نویسی اور خاصکر ہم عصروں کے حالات لکھنے کے بہت شایق ہیں۔ ان میں کسر اتنی ہے جو ہم میں بھی پائی جاتی ہے کہ تاریخ وفات کا ذکر نہیں ہوتا۔ یہ تذکرے کسی تجارتی خیال سے نہیں لکھے جاتے بلکہ ادب کی اہم شاخ ہیں۔ اُن میں مولفین کو اپنی فصاحت و بلاغت دکھلانے کا خوب موقع ملتا ہے اور مشہور شعرا اور دوستوں کی تعریف بڑے مبالغہ سے کرتے ہیں اور انتخاب کلام سے اپنے ذوق کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ حالات جو تذکرے کہلاتے ہیں ایک قسم کے انتخابات ہیں۔ جن میں مصنفین کے حالات مبالغہ آمیز تعریف کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات یہ حالات کئی کئی صفحوں کے ہوتے ہیں جو شاندار الفاظ اور پیچیدہ ترکیبوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے اور اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ صرف مصنف کا نام لکھ دیا جاتا ہے پہلی قسم کے حالات میں تعریف کے بعد دس بیس یا تیس صفحوں میں کلام کا انتخاب ہوتا ہے اور دوسرے قسم کے حالات میں دو تین شعر اور بعض اوقات صرف ایک ہی شعر ہوتا ہے۔ یہ تذکرے ایک طرح سے اپنی روشناسی کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں کیوں کہ مؤلفِ تذکرہ مصنفین کے حالات میں موقع بے موقع اپنا نام بھی داخل کر دیتا ہے اور اکثر مہربانی سے اپنا ذکر بھی کر جاتا ہے۔ وہ اپنے حقیقی حالات اس طرح لکھ جاتے ہیں جو انھیں دوسروں کے لکھنے چاہئیں تھے اور اُس کے ساتھ ہی کثرت سے اپنے اشعار بھی نقل کر دیتے ہیں۔ یورپ میں عام دستور یہ ہے کہ کم و بیش مشہور اشخاص کے حالات لکھتے وقت نہایت احتیاط کے ساتھ ایسی تفصیلات کا ذکر کرتے ہیں جن سے کسی کو دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف ہندوستانی تذکروں میں اس قسم کے تمام تفصیلی حالات ترک کر دئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بات ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کی جاتی۔ ان تذکروں میں قدیم شعرا وہ ہیں جو مؤلف کے زمانے سے پہلے گزرے ہیں اور ہم عصر شعرا جدید شاعر خیال کئے جاتے ہیں۔ ان میں تاریخ و سنہ اور خاصکر سنہ پیدائش خال خال کہیں کہیں آجاتا ہے اہل مشرق میں اس کا بہت کم رواج ہے اور عموماً وہ اپنی عمر تک نہیں جانتے۔ اس لئے مجبوراً طرز تحریر دو

دوسرے قرائن سے یہ قیاس کرنا پڑتا ہے کہ یہ کس صدی کا شاعر ہے۔ اور اکثر کاتبوں کے تصرّف اور تغیر و تبدل سے اس کا پتہ لگانا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔

بہرحال مولفین تذکرہ اکثر غیر معروف شعراء اور بعض اوقات نامعلوم حضرات کے ناموں سے اپنی کتابوں کا حجم بڑھا دیتے ہیں، جس طرح ہمارے سیرت نویس اپنی کتاب کی جلدیں بڑھانے کے لئے غیر معلوم اشخاص کا نام کھود کھود کر نکالتے ہیں۔

اسی طرح یہ تذکرے تنقید کا عمدہ نمونہ نہیں ہیں۔ اتفاق سے جب کبھی دو یا کئی شاعروں کا نام ایک ہی ہوتا ہے تو بڑی پریشانی ہوتی ہے اور تفصیل نہ ہونے کی وجہ سے بڑی مشکل پڑ جاتی ہے۔ غرض یہ کہ تذکرہ ایک خاص قسم کی تصنیف ہے جو دلچسپی اور خوبی سے خالی نہیں، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بہت سے مصنفین نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ ضمناً ان تذکروں سے ہمیں مشاعروں کے متعلق بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مشاعرے ایک قسم کی مجلسیں ہیں جو اردو شاعری کی حصول و ترقی کی غرض سے قائم کی جاتی ہیں۔ اور وہاں شعرا ایک دوسرے کے مقابلہ میں فی البدیہ یا ہم طرح اشعار کہتے ہیں۔ اُن مشاعروں میں جو شہر کے ممتاز باشندوں کے ہاں منعقد ہوتے ہیں، پندرہ سے بیس تک اعلیٰ درجہ کے شاعر ہوتے ہیں۔ اور یہ لوگ عموماً شرفائے ملک میں سے ہوتے ہیں۔ مولوی کریم الدین نے جن کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا، حال میں دہلی کے ایک خاص رسالہ میں جس کا نام گل رعنا ہے ان نظموں کو شایع کیا ہے، جو اِن مشاعروں میں کہی گئی یا پڑھی گئی تھیں۔ اِن کے علاوہ ایسی مجلسیں بھی ہوتی ہیں جہاں قصّہ خواں اپنے قصّے سُنا کر حاضرین کو لطف اندوز کرتے ہیں۔ چند سال ہوئے دہلی میں ایک قصّہ خواں مرزا حسن نامی تھا جس سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ ان قومی قصوں کو لکھ ڈالے جنھیں وہ بڑی خوبی سے بیان کیا کرتا ہے۔

عموماً یہ تذکرے شعرا کے تخلصوں کی ابجدی ترتیب کے لحاظ سے مرتب ہوتے ہیں۔ پہلے تخلص ہوتا ہے اس کے بعد نام۔ اس کے سوا شاذ و نادر ہی کوئی دوسری ترتیب ہوتی ہے۔

ان ہندوستانی تذکروں میں بہت سے فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ کیونکہ زمانۂ حال تک اس قسم کی چیزیں ہندوستانی

مسلمانوں کی علمی زبان ہی میں لکھی جاتی تھیں، جیساکہ ایک زمانے میں ہمارے ہاں رومن یالاطینی زبان میں لکھنے کا دستور تھا مثلاڈوبلے نے فرانسیسی صرف ونحو اور پٹرارک نے اپنی قابل تعریف اطالوی نظموں پر لاطینی میں حواشی لکھے۔

میں نے ہندوستانی تذکروں کی سیرت نویسی اور اُن کے عیب وصواب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا ٹھیک نمونہ میں ایک ہندوستانی تذکرے سے نقل کرتا ہوں، میں نے دو مثالیں منتخب کی ہیں، ان میں سے ایک مختصر اور دوسری طویل ہے۔تذکرہ کا مصنف مرزا علی خاں لطف ہے اور تذکرہ کا نام گلشنِ ہند ہے۔

میں پہلے مختصر مثال کو نقل کرتا ہوں جس میں باوجود نہایت اختصار کے وہ حاتم کو جیساکہ میں اوپر لکھ چکا ہوں، ایک مشہور شاعر بیان کرتا ہے۔ اس کے حالات دوسرے تذکرہ نویسوں نے زیادہ تفصیل سے لکھے ہیں۔

"حاتم تخلص، شاہجہاں آبادی مشہور ریختہ گویوں میں سے دلّی کے تھے۔ ہم عصر شاہ نجم الدین آبرو اور میرزا رفیع سودا کا، شاعر خوش بیان تھا، صاحبِ دو دیوان تھا۔ ایک دیوان میں نہایت خرچ ابہام کیا ہے، اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے۔ جامع ہے طور متاخرین اور طرز ابہام کا" اس کے بعد حاتم کے کلام سے ۲۰ شعر نقل کئے ہیں جو میں نے بطور نمونہ دوسری جگہہ درج کئے ہیں۔

دوسری مثال میں ایک بادشاہ شاعر یعنی ابوالحسن بادشاہ گولکنڈہ کی پیش کرتا ہوں۔ جو ۱۰۸۰ھ (۷۳ — ۱۶۷۲ء) میں تخت پر بیٹھا اور جب اورنگ زیب نے ۱۶۹۰ء میں گولکنڈہ فتح کیا تو اُسے قید کر دیا اور وہ قید ہی میں ۱۷۰۴ء میں انتقال کر گیا۔ یہ اپنے پیش رو عبداللہ قطب شاہ کی طرح ہندوستانی زبان کا شاعر تھا، تانا یا تانا شاہ تخلص کرتا تھا اور ہندوستانی شاعر کا قدر دان اور سرپرست تھا۔ چنانچہ اس کے عہدہ داروں میں سے ایک شخص مرزا (ابوالقاسم) کا ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ دکن میں اپنے زمانہ کا نہایت مشہور شاعر تھا۔

"نام نامی اور اسم گرامی اس بادشاہِ عشرت دوست کا ابوالحسن تانا شاہ ہے۔ سلاطین نامدار

اور خوانینِ عالی مقدار دکھن سے تھا۔ اگرچہ شہرہ عیش ونشاط کا اور آوازہ مسرّت اور انبساط کا اس عیش مجسم کے ماہ سے ماہی تک مشہور ہے۔ لیکن کچھ تھوڑا سا احوال اس سریرآرا بارگاہِ عیش وکامرانی کا یہاں لکھنا ضرور ہے۔

جن ایّام میں کہ عالمگیر خلد مکان نے عادل شاہی اور نظام شاہیوں کو زیر وزبر کیا، اور صوبہ دکن کو بدبہت سی خرابی کے لیا، تو ابوالحسن تانا شاہ بھی نظر بندی میں آئے، اور فلک نیرنگ باز نے بدلے اس عیش وعشرت کے اور ہی رنگ دکھائے۔ سامان عیش سب برہم ہوا، اور مجمع اربابِ نشاط حلقۂ ماتم ہوا۔ خلد مکان نے جس قدر تنگی اُن کے اوقات میں چاہی، انھوں نے قبول کیا۔ لیکن حقّے کے مقدمے میں بہت سماجت کے ساتھ اتنی بات کہلا بھیجی کہ اس کا شوق مجھے نہایت ہے، جو رعایت کہ اس کے سامان میں ہوگی وہ عین عنایت ہے۔

ازبسکہ یہ بادشاہ عشرت دوست آٹھ پہر نشۂ عیش میں مخمور رہتا تھا، حقّہ ایک دم مُنہ سے نہیں چھٹتا تھا اور یہ بھی معمول تھا کہ بعد ہر چلم کے ایک شیشے سے گلاب کے حقہ تازہ ہووے، پھر ایک شیشے میں بید مشک کے حقہ بردار نیچے کو بھگووے۔ شغل میں عیش ونشاط کے ازبسکہ دن کو کم سوتے تھے سینکڑوں شیشے گلاب خالص اور عرق بید مشک کے دن رات میں خرچ ہوتے تھے۔ یہ سب احوال مفصّل خلد مکان کو معلوم تھا۔ علاوہ اس کے بادشاہ نے اس عجز سے کہلا بھیجا، بارہ سولہ شیشے گلاب کے اور آٹھ شیشے بید مشک کے حکم فرمائے۔ سُبحان اللہ! یا تو حقہ آٹھ پہر مُنہ سے نہیں چھٹتا تھا اور اُن کے دورِ محفل کے رشک سے دھواں حسد کا حقۂ سرِ آسماں میں گُھٹتا تھا، یا پیچ سے فلکِ حقہ باز کے آٹھ چلمیں دن رات میں یہ پیتے تھے اور گھونٹ گھونٹ کر عجیب پیچ وتاب کے ساتھ جیتے تھے۔ اس میں بعد کئی دن کے حضرت خلد مکان نے فرمایا کہ سولہ شیشے گلاب اور بید مشک کے ہر روز حقے کے مصرف میں آنے اسراف ہے اور امورات شرعی میں پاسِ خاطر بیجا بیجا، اور تکلف رسمی معاف ہے۔ آٹھ شیشے ہر روز یہاں سے جایا کریں۔ ایک شیشے ت بعد ہر چلم کے حقہ تازہ کرکے آٹھ چلمیں دن رات میں پئیں۔ جب حضور سے آٹھ شیشے ہر روز آنے لگے تو یہ دن رات میں لاچار چار چلموں سے دل بہلانے لگے

یہ ماجرا سن کر خلد مکان نے ضد کے مارے چار شیشوں کی اور تخفیف کی۔ انھوں نے اپنے حقّہ بردار کو دو چلموں کی پروانگی دی۔ بعد کئی دن کے جب دو شیشے اور کم ہوئے تو ایک چلم دن رات میں یہ پیا کرتے تھے۔ جس دن ان دونوں شیشوں کا بھی آنا موقوف ہوا، اُس دن انھوں نے عرض کیا، جہاں پناہ کی دولت سے اتنا کچھ بعد خرچ کے جمع کیا ہے کہ دس چلمیں روز خرچ کے ساتھ سالہاسال پلا سکتا ہے۔ امید ہے کہ بھنڈی خانے کے خرچ کا غلام کو حکم ہووے کہ نہال نمک حلالی کا زمین میں سرخروئی کے بووے۔ ارشاد فرمایا کہ حضرت اعلیٰ کو امورات شرعی کا بہ شدّت دھیان ہے، اگرچہ مسجد کا کھود ڈالنا، خزانہ اُس کے نیچے گڑا سن کر نہایت آسان ہے۔ تو جو ہمارے مصرف بیجا کا کفیل ہوتا ہے، ابھی ایک دم میں جمع پونجی سر پر ہاتھ دھر کے روتا ہے۔ غرض اُس دن سے پھر حقّہ نہ پیا، جب تک کہ ان کی نظر بندی میں رہے اور اس سرائے فانی سے عالم باقی کو تشریف لے گئے۔ سبحان اللہ! چشم حقیقت بیں سے اگر کوئی دیکھے تو دنیا جائے حسرت ہے، بلکہ خانۂ رحمت۔

کدھر ہیں خسرو جم لطف، کیقباد کدھر کہاں سکندر و دارا، کہاں ہے کیکاؤس
جو مستِ جاہ ہیں دیکھیں وہ چشم عبرت سے کچھ اُن کے ساتھ گیا غیر حسرت و افسوس؟

اگرچہ ملک گیری اور کشورستانی کے معاملے کو سمجھنا شاہان عالی تبار پر ختم ہوا ہے، گدائے گوشہ نشین کو دخل ان امورات میں کیا ہے۔ لیکن بعضے دانشمند کہتے ہیں کہ خلد مکان نے استیصال پادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا اور مکہ مسجد کو کھدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہے۔ تحصیلِ حاصل سے بھی اس میں کچھ کیفیت زیادہ ہے۔ کس واسطے کہ پیش از تسخیر دکن کے بھی خراج و باج اس طرف سے چلا آتا تھا اور بادشاہان ہندوستان کا شہنشاہ کہاتا تھا مآل اس مشقت کا اعجوبہ نظر آیا کہ اِس حُسنِ تردّد نے شاہنشاہ کو بادشاہ کر دکھادیا۔

واقف رموزِ ملک سے ہیں شاہ و شہر یار ہے تو گدائے گوشہ نشین لطف کچھ نہ بول

غرض شاہ عالی جاہ ابوالحسن تاناشاہ کی طرف لوگ اس مطلع کو منسوب کرتے ہیں اور باعتبار محاورہ دکن کے اور بندش قدیم کے، کہ اس مطلع میں ہے، ابراہیم خاں مرحوم بھی گفتگو پر لوگوں کی

گوش دل کو دھرتے ہیں۔ مطلع یہ ہے:-

کس در کہوں، جاؤں کہاں مجھ دل پہ بھل بھجراٹ ہے

اک بات کے ہوں گے سجن، یہاں جی ہی بارہ باٹ ہے"

اگرچہ دکن اور وسط ہند کی ہندوستانی شاخ میں شمالی ہند کی زبان یا اُردو کی نسبت بہت بڑی بڑی نظمیں موجود ہیں، تاہم اُردو زبان کو جس میں غزلوں، قصیدوں اور چھوٹی چھوٹی مثنویوں کے مجموعوں کو دیوان کے نام سے موسوم کرتے ہیں، زیادہ فوقیت حاصل ہے اس لئے کہ یہ زیادہ باقاعدہ لکھی جاتی ہے۔ تمام تذکروں میں جس کا میں نے ذکر کیا ہے، اُردو کے شاعروں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اور دکنی شعرا کے متعلق سوائے سرسری ذکر کے کچھ زیادہ نہیں لکھا۔ چنانچہ میرؔ نے اپنے تذکرے نکات الشعرا کے دیباچے میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے میرے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "اگرچہ ریختہ در دکن است، چوں از انجا یک شاعر مربوط برنخواستہ لہذا شروع بنام آنہا نکردہ، و طبع ناقص مصروف اینہم نیست کہ احوال اکثر انہا ملال اندوز گردد۔ مگر بعضے از انہا نوشتہ خواہد شد، انشاءاللہ تعالیٰ"۔

ہندی شعرا کے الگ تذکرے ہیں جنھیں کب مالا کہتے ہیں۔ مگر مجھے جو دستیاب ہوئے ہیں وہ بہت ہی کم ہیں۔

ہندوستانی مصنفین کے لکھے ہوئے تذکرے یا انتخابات سب ملاکر ۰۷ ایسے ہیں جن کا مجھے علم ہے۔ اِن تذکروں اور اُن کے مصنفین کا تفصیلی حال میری تاریخ ادب ہندوستانی میں درج ہے۔

۲۔ اُن شعرا کی تعداد جن کا ذکر تذکروں اور دوسری تصنیفات میں پایا جاتا ہے اور جن تک بلا واسطہ یا بالواسطہ میری دسترس ہوئی ہے، تخمیناً تین ہزار ہے۔ لیکن یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ یہ سب کے سب حقیقت میں شاعر تھے، کیوں کہ ایسے مصنفین کا شمار بھی جنھوں نے دوسرے علوم مثلاً قانون اور دینیات پر کتابیں لکھیں ہیں، شاعروں میں کرلیا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے

اور اس وجہ سے شاعر کہلانے لگے۔ علاوہ اس کے شاعر کی اصطلاح مبہم سی ہے اس کے معنی مصنف کے بھی ہوتے ہیں، جیسے یورپ میں بعض اوقات عام آدمی اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ گویا "شاعر" کو "مصنف" کے معنوں میں خیال کرنا چاہئے، اگرچہ ہندوستانی تذکرے زیادہ تر شعرا کے کلام کے انتخابات ہوتے ہیں جن میں اُن کے حالات بھی درج ہوتے ہیں، تاہم اُن میں اُن مصنفین کا بھی ذکر آجاتا ہے (اگرچہ یہ بہت شاذ و نادر ہوتا ہے) جنھیں ہم مشکل سے شاعر کہہ سکتے ہیں، اور اُن کی نثر کی تالیفات کا بھی بیان ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ تمام مشرقی ادب میں اور خاص کر ہندوستانی ادب میں شاعری کو سب علوم پر تفوق حاصل ہوتا ہے۔ اس سے میرا مطلب محض نظم سے نہیں جو الفاظ کا باضابطہ مجموعہ ہے بلکہ ان موزوں خیالات سے ہے جو حُسن وخوبی کے ساتھ ادا کئے گئے ہیں جو تمدّن کی روح رواں ہے اور تاریخ سے کہیں بہتر اِن خیالات سے ہمیں کسی ملک کے تمدّن کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

علاوہ اس کے ہندوستانی نثر کی کتابیں بھی ایک حد تک نظم میں شریک کی جاسکتی ہیں۔ کیونکہ مشرق کے مسلمانوں کی اور زبانوں کی طرح ہندوستانی میں بھی تین قسم کی نثر ہے جن میں سے ہم صرف ایک کو نثر کہہ سکتے ہیں۔ پہلی قسم کو مرجز کہتے ہیں، جس میں موزونیت بغیر وزن کے ہوتی ہے۔ دوسری مسجع ہے جس میں وزن تو ہوتا ہے، مگر قافیہ نہیں ہوتا۔ تیسری عاری ہے جس میں نہ وزن ہوتا ہے نہ قافیہ۔

ہندوستانی کے اکثر شاعر ایسے ہیں جنھوں نے فارسی میں بھی نظمیں لکھی ہیں جیسا کہ پہلے زمانے میں ہمارے ہاں بھی رواج تھا کہ فرانسیسی شعرا اپنی زبان کے علاوہ آسانی سے لاطینی میں بھی شعر کہتے تھے، اور روم میں علاوہ لاطینی کے یونانی میں بھی نظمیں لکھتے تھے۔ اس رواج سے ایک دوسرا رواج نکلا، یعنی جو شاعران دو زبانوں میں شعر کہتے ہیں وہ تخلص بھی دو رکھتے ہیں۔ جن میں سے ایک ہندوستانی میں اور دوسرا فارسی میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً وجیہ الدین کے دو تخلص ہیں، ایک وجیہ دوسرا عبرتیں۔ اور اسی طرح محمد خاں کے ہندوستانی اور فارسی میں واکہ اور ثاقب دو تخلص ہیں

ہم اِن بیشمار مصنفین کی تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ پہلا امتیاز جو بالکل قدرتی معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ہم انھیں ہندو مسلمانوں میں تقسیم کریں۔ لیکن یہ خیال رہے کہ مسلمانوں میں شاذ و نادر ایسے لوگ ملیں گے جنھوں نے ہندوی یا ہندی شاخ میں نظم لکھی ہے، حالانکہ بہت سے ہندوؤں نے اُردو نیز دکھنی میں نظمیں لکھی ہیں، بعینہٖ جیسے وہ پہلے فارسی میں لکھتے تھے جیسا کہ سید احمد نے آثار الصنادید میں بیان کیا ہے جس کا اقتباس میں اس سے پہلے دے چکا ہوں۔ تین ہزار شعرا میں سے، جن کے متعلق میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، دو ہزار دو سو سے زیادہ مسلمان ہیں، باقی صرف آٹھ سو ہندو ہیں۔ جن میں سے صرف (۲۵۰) کے قریب ایسے ہیں جنھوں نے ہندی میں نظمیں لکھی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اس تقسیم کے لئے ہمارا علم بہت ناکافی ہے کیونکہ ہندوی اور ہندو شعرا کے تذکرے بہت کم دستیاب ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے بہت سے شاعروں کا نام تک نہیں معلوم ہوا۔ لیکن اردو شاعروں کی یہ حالت نہیں ہے، کیونکہ اُن کے تذکرہ نویسوں نے اور کچھ نہیں تو کم سے کم نام تو دیدیا ہے، یہ زیادہ تر پنجاب، کشمیر، راجپوتانے اور سرزمین فصاحت ممالک مغربی شمالی (یہ نام کلکتہ کے لحاظ سے رکھا گیا ہے جو انگریزی حکومت کا مستقر ہے) دہلی، آگرہ برج اور بنارس کے ہندو باشندے ہیں جو اصل اُردو میں لکھتے ہیں اور یہ ہندوستانی کی سب سے فصیح اور شستہ شاخ سمجھی جاتی ہے۔

اگر ہم ان شاعروں کے وطنوں کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ کون سے ایسے شہر ہیں جہاں ہندوستانی زبان کی اسلامی شاخیں نہ صرف استعمال کی جاتی ہیں بلکہ بطور ادب کے ان کی تعلیم ہوتی ہے، دکھنی بولی سورت، بمبئی، مدراس، حیدرآباد، سری رنگاپٹم اور گولکنڈہ میں بولی اور لکھی جاتی ہے۔ اُردو دہلی، آگرہ، لاہور، میرٹھ، لکھنؤ، بنارس، کانپور، مرزاپور، فیض آباد، الہ آباد اور سب سے آخر کلکتہ میں جہاں ہندوستانی صوبہ کی ملکی زبان ساتھ ساتھ استعمال کی جاتی ہے۔

امّن نے جو پہلا ہندوستانی نثر نگار خیال کیا جاتا ہے اپنی کتابیں کلکتہ میں لکھیں، وہ باغ و بہار کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ

"سو اُردو کی آراستہ کر زبان کیا میں نے بنگالا ہندوستان"

ان شعرا کے محض ناموں سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کون مسلمان ہیں اور کون کون ہندو اور خود یہ نام بھی بہت دلچسپ مضمون ہیں اور مطالعہ کے قابل ہیں۔ میں نے ایک دوسرے مضمون میں جس کا عنوان "مسلمانوں کے نام اور القاب" ہے اس بارے میں بہت کچھ لکھا ہے یہاں میں صرف اس قدر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان شعرا کے نام بعض اوقات چھ چھ تک ہوتے ہیں۔ ایک عَلَم ہے جو اکثر کسی ولی یا نبی کے نام پر ہوتا ہے۔ دوسرا لقب ہے جو ایک قسم کا اعزازی نام ہے جیسے غلام علی، امداد علی وغیرہ[۱]۔ تیسرا کنیت جس سے ابنیت یا ابویت کا پتہ لگتا ہے جیسے ابوطالب ابن ہشام۔ چوتھا نسبت جس سے شاعر کا وطن معلوم ہوتا ہے جیسے لاہوری، قنوجی وغیرہ پانچواں تخلص یعنی وہ نام جو نظم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ عموماً عربی یا فارسی کا اسم یا صفت ہوتا ہے، ہندی نہیں ہوتا ہے۔

جس طرح مسلمان اپنے نام اپنے اولیا کے ناموں پر رکھتے ہیں اسی طرح ہندوؤں کے نام اُن کے دیوتاؤں پر ہوتے ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کے نام محمد، ابراہیم، حسن، حسین وغیرہ پر ہوتے ہیں اور ہندوؤں کے ہر، نراین، رام لکشمن، گوپی ناتھ، گوکل ناتھ، کاشی ناتھ وغیرہ۔

مسلمانوں کے اعزازی ناموں مثلاً عبدالعلی، غلام محمد، علی مردان وغیرہ کے مقابلہ میں ہندوؤں کے ہاں سیو داس، کرشن داس، مہادیو داس، کیشوا داس، نند داس، ہلدھر داس، سور داس وغیرہ ہوتے ہیں۔

ہندو نہ صرف اپنے دیوتاؤں کے غلام ہوتے ہیں بلکہ اپنے دریاؤں اور مقدس درختوں اور شہروں کے بھی داس ہوتے ہیں مثلاً گنگا داس، تلسی داس، آگرہ داس، دوارکا داس وغیرہ۔

مسلمانوں میں ایک اور قسم کے بھی نام ہوتے ہیں جیسے محبوب علی، محبوب حسین، ہندوؤں میں بھی بعینہٖ یہی نام پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سری لال (یعنی سری یا لکشمی کا محبوب) ہربنس لال (یعنی شیو کے خاندان کا محبوب)۔

---

[۱] یہاں مصنف سے سہو ہو گیا ہے۔ یہ مثال علم کی ہے

عطاء اللہ، عطا محمد، علی بخش مسلمانوں کے نام ہیں۔ ہندوں میں اس کے جواب میں بھگوان وت (بھگوان کی عطا) رام پرشاد (رام کا عطیہ) سیو پرشاد، کالی پرشاد ہندوں کے ہاں پائے جاتے ہیں ہندوں کے بعض ہندی فارسی سے مرکب ہوتے ہیں جیسے گنگا بخش وغیرہ۔

مسلمانوں کے بعض نام اسد، شیر وغیرہ پر ہوتے ہیں۔ ہندوں کے نام اسی طرح سنگھ پر پائے جاتے ہیں جس کے معنی بھی شیر ہی کے ہیں۔

اب رہا خطاب۔ یہ ہندوں کی مختلف ذاتوں میں خاص خاص ہوتا ہے۔ مثلاً برہمنوں کو چوبے تواری، دوبے اور پانڈے کہتے ہیں۔ چھتریوں کو راجپوت اور سکھ۔ ٹھاکروں کو رائے اور سنگھ ویشوں (سوداگروں) کو ساہ یا سیٹھ، ودیاوان یعنی علما و فضلا کو پنڈت اور سین۔ وید یعنی اطبا کو مصر۔ ہندو فقرا کو گرو، بھگت، گوسائیں، یا سائیں اور سکھ فقیروں کو بھائی کہتے ہیں۔

مسلمان بھی ہندوں کی طرح چار ذاتوں میں منقسم ہیں۔ یعنی سید، شیخ، مغل اور پٹھان۔ سید، محمد (صلعم) کی اولاد ہیں۔ شیخ عربی نسل سے ہیں۔ لیکن جو لوگ نومسلم ہیں وہ بھی اپنے آپ کو شیخ کہتے ہیں۔ مغل اپنے نام سے پہلے مرزا یا نام کے پیچھے بیگ لکھتے ہیں۔ انھیں آغا یا خواجہ بھی کہتے ہیں۔ پٹھان خان کہلاتی ہیں۔ مسلمان فقرا کو شاہ، صوفی، یا پیر کا خطاب دیا جاتا ہے۔ خواتین کو خانم، بیگم، صاحبہ، بی، یا بی بی کے خطابات سے موسوم کرتے ہیں۔

سری اور دیو ہندوں میں بڑے عزت کے نام ہیں پہلے کے معنی رشی اور دوسرے کے معنی دیوتا کے ہیں۔ یہ الفاظ بعض اوقات گاؤں، پہاڑوں، دریاؤں وغیرہ کے ساتھ بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ قدیم فرانس میں بھی دیوس اور دیوا کے نام شہروں، جنگلوں اور پہاڑوں کے ساتھ اسی طرح استعمال کئے جاتے تھے یہ ہندی رسم کیلٹک زبان اور ڈروڈی مذہب کے تخم کے ساتھ گنگا کے کنارے سے میوز، مارن اور سین[۱] تک پہنچی۔

اِس زمانہ میں بھی روسی اپنے ملک کو ہولی رشیا یعنی مقدس روس کہتے ہیں۔

---

[۱] یہ تینوں فرانس کے دریا ہیں۔

آج کل بھی ہندوستان کے فرماں روا اپنی سلطنتوں کے نامور شعرا یا مقرّبین کو یا اسلامی خطاب مثلاً سید الشعرا یا ملک الشعرا یا ہندوی خطاب مثلاً کبیشر یا برکبی عنایت فرماتے ہیں۔

جو ہندو اُردو میں شعر کہتے ہیں وہ بھی مسلمانوں کے رواج کے موافق تخلص رکھتے ہیں اور یہ تخلص عمومًا فارسی الفاظ ہوتے ہیں جو ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی زبان ہے۔ ایک ہی تخلص ہندو اور مسلمان کا ہو سکتا ہے اور اس لئے صرف تخلص سے یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ شاعر ہندو ہے یا مسلمان

ان شعرا میں بعض ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو ہندو سے مسلمان ہو گئے ہیں۔ لیکن کوئی مسلمان ایسا نہیں پایا جاتا جو ہندو ہو گیا ہو[۱]۔ البتہ ایسا ہوا ہے کہ بعض مسلمان ایسے فرقوں میں مل گئے ہیں جن میں کامل اصلاح ہو گئی ہے اور ہندوؤں سے الگ ہو گئے ہیں مثلاً سکھ، جو ایسے مسلمانوں کو جنھوں نے ان کا مذہب اختیار کر لیا ہے مذہبی کہتے ہیں۔

درحقیقت مسلمان سے ہندو ہونا تنزل ہے اور برخلاف اس کے ہندو کے لئے مسلمان ہونا ایک قسم کی ترقی ہے، کیونکہ اسلام کی بنا توحید اور حشر (آیندہ زندگی) پر ہے۔ علاوہ اس کے ہندوستان کے مسلمانوں پر عقلیت کا اثر نہیں ہوا ہے۔ وہ اپنے عقاید میں ابھی تک ویسے ہی پکّے ہیں۔ اگرچہ عملاً ہندو مذہب نے اُن کے عقاید و رسوم پر ضرور اثر ڈالا ہے اور اب تک روزانہ نئے لوگ ان کے مذہب میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو شعرا اسلام اختیار کر لیتے ہیں۔ اور اپنے اشعار میں توحید کا گیت گاتے ہیں۔ مضطر (لالہ کنور سین) ایسے ہی لوگوں میں سے ہے جس نے فصیح ہندوستانی میں شہادتِ حسینؑ کو منظوم کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک درجن شاعر اور ایسے ہیں جن کا ذکر ہندوستانی تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔

ہندوستانی شعرا میں ہم ایسے ہندو بھی پاتے ہیں جو عیسائی ہو گئے ہیں اور سب سے زیادہ عجیب اور شاذ و نادر بات یہ ہے کہ بعض مسلمان بھی ایسے ہیں جنھوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ شیفتہ اپنے تذکرے میں شوکت کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ یہ مسلمان تھا بعد میں عیسائی ہو گیا

---

[۱] بھگت مل نے البتہ ایک ایسے مسلمان کا ذکر کیا ہے جو ہندو ہو گیا تھا۔

"کہتے ہیں کہ بنارس میں شوکت کا ایک یورپین سے بہت دوستانہ تھا اور اس کے اغوا سے وہ اسلام کو ترک کر کے عیسائی ہو گیا - خدا اس بلا سے محفوظ رکھے - اب اس نے اپنا نام منیف علی سے بدل کر منیف مسیح رکھ لیا ہے"

ایسی حالت میں نام کا بدلنا ضروری ہے - ایک اور ہندوستانی شاعر جس کا نام فیض محمد تھا تبدیل مذہب کے بعد اس نے اپنا نام فیض مسیح رکھ لیا، تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مسیحیوں کے طرح ہندو نو عیسائی اپنا اصلی نام قائم رکھتے ہیں حالانکہ ان ناموں کے معنی ہندوانہ ہوتے ہیں - اسی طرح زندہ ہندو مصنفین میں ہم بابو سری داس (سری لکشمی کے داس) کا نام پاتے ہیں، جنھوں نے مسلمان ہونے کے بعد خدا کی صفات پر ایک کتاب تالیف کی ہے جس کا نام شفاعت رب الامین ہے -

ہندوستانی تذکروں میں بعض ایسے ہندوستانی شعرا کا بھی ذکر پایا جاتا ہے جو نسلاً یہودی تھے مگر بعد میں مسلمان ہو گئے - مثلاً میرٹھ کا جمال جن کا ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے، ساٹھ برس ہوئے حیدر آباد میں تھا - دہلی کا جوان (محب اللہ) جو طبیب تھا اور عشق کا شاگرد تھا، اور آخر میں مشتاق کا جو ایک انتخاب کلام شعرا کا مؤلف ہے شاگرد ہو گیا -

اگرچہ پارسی عموماً گجراتی میں اور کبھی کبھی فارسی میں لکھتے ہیں تاہم بعض پارسی ایسے بھی ہوئے ہیں جن کا کلام اردو میں پایا جاتا ہے - چنانچہ بمبئی کے بومن جی دوسا بھائی کا شکنتلا ناٹک ہندوستانی زبان میں شایع ہوا ہے -

انھیں تذکروں میں بعض عیسائی یورپینوں کا ذکر بھی پایا جاتا ہے گو وہ خالص یورپین نہ ہوں مگر نسلاً یورپین ہیں، مثلاً سومبر یورپین اور سردھنے کی مشہور بیگم شمرو ملقب بہ زینت النسا کا بیٹا تھا اور صاحب تخلص کرتا تھا - اس کا خطاب ظفریاب تھا، وہ دلسوز کا شاگرد تھا، اس کے اردو اشعار مقبول ہوئے دہلی میں اس کے مکان پر مشاعرے ہوتے تھے جن میں شہر کے ممتاز شعرا شریک ہوتے تھے، انھیں میں ایک صاحب سرور بھی تھے - جن کی بدولت ہمیں یہ حالات معلوم ہوئے ہیں - کہتے ہیں کہ اس کا خط بہت پاکیزہ تھا جو مشرق میں بہت قابل قدر فن خیال کیا جاتا ہے - اسے نقشہ کشی اور موسیقی میں بھی کمال حاصل تھا

عین عنفوانِ شباب میں ۱۸۲۷ء میں انتقال ہو گیا۔

اس کا ایک دوست بل تھرز نامی تھا جو آسیر تخلص کرتا تھا اور ہندوستانی میں خوب شعر کہتا تھا۔ سرور کا بیان ہے کہ یہ شخص فرنگی اور نصرانی تھا اور اس کے اشعار میں جن کا انتخاب اس نے دیا ہے جدّت پائی جاتی ہے۔

سردھنے کے چھوٹے سے دربار میں ایک تیسرا یورپین ہندوستانی شاعر اور تھا جو فرانسیسی تھا۔ وہ اپنے تئیں فراسو یا فرانسو کہتا تھا یعنی فرانسیسی۔ کہتے ہیں کہ وہ بیگم سردھنہ کے ایک عہدہ دار اگستے یا اگستن کا بیٹا تھا۔ وہ اچھے شعر کہتا ہے اور اسی دلسوز کا شاگرد ہے جس کے تلمّذ کا فخر صاحب کو حاصل تھا اور دہلی کے مشہور شعرا میں سے خیال کیا جاتا تھا۔

اس عہد کے ایک ہندوستانی شاعر کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو عیسائی اور انگریز ہے اور جس کا نام ہندوستانی تذکرہ نویس کریم الدین نے جارج بنس شور لکھا ہے۔ تذکرہ نویس نے غلطی سے خاندانی نام کو تخلص (شور) سے ملا دیا ہے[1]۔

ان کے علاوہ ہندوستانی شعرا میں دو اور انگریزوں کے نام پائے جاتے ہیں جو دلّی کے رہنے والے تھے۔ ایک آسفن یعنی اسٹیفن یا اسٹیون جو ۱۸۳۰ء تک زندہ تھا اور دوسرا جان تومس یعنی جان ٹامس جو خان صاحب کے نام سے مشہور ہے اور ہم عصر شاعر ہے۔

میں بھی اسی قسم کے ایک ہندوستانی شاعر سے واقف ہوں جس کا نام ڈائس سومبر تھا اور جسے بیگم سردھنہ (شمرو بیگم) نے گود لیا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس کا نام اکثر انگریزی اخباروں میں آیا ہے کیوں کہ وہ ملکی حقوق سے محروم کر دیا گیا اور اس کے لئے وہ آخر تک لڑتا رہا۔ ڈائس سومبر بلا تکلف اُردو شعر کہتا تھا اور پڑھتا بھی خوب تھا۔

ایک حبشی کا بھی تذکروں میں ذکر آیا ہے جو ہندوستانی زبان کا شاعر تھا، اس کا نام سیدی حامد

---

[1] میرے انڈیا آفس کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس شخص کا نام جارج پیشے (George Pesche) تھا اور وہ دوغلا یعنی فرانسیسی ہندوستانی اور ضلع میرٹھ کا زمیندار تھا۔ تخلص شور کرتا تھا۔ (مترجم)

بسمل ہے۔ اس شخص کا نام ان نامور حبشیوں کی فہرست میں شریک کرنا چاہئے جو بشپ گریگوری نے اپنی کتاب "ادبیات حبشیان" میں دی ہے یہ حبشی شاعر پٹنہ کا رہنے والا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غلام تھا وہ اس صدی کے آغاز میں ہوا ہے۔

ہندی کے تقریباً تمام شاعر ہندؤں کے مجدّد (اصلاح یافتہ) فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں یعنی یا تو جینی ہیں یا کبیر پنتھی یا سکھ یا وشنوی، اور ان فرقوں کے بانی یا سردار، نامور سے نامور اور گمنام سے گمنام سب ہندی کے شاعر ہوئے ہیں۔ مثلاً رامانند ولبھا، دریاداس، جے دیو (سنسکرت کی مشہور نظم گیتا گووند کا مصنف) دادو، بیربھان، بابالال، رام چرن، شیونرائن وغیرہ

ایسے شیوی شاعر جن کا کلام ہندی میں ہے بہت ہی کم ہیں۔ ان میں کے اکثر قدیم زبان اور قدیم مذہب کے دلدادہ ہیں۔

ہندوستان کے مسلمان مذہبی لحاظ سے شیعہ سنی میں تقسیم ہیں۔ لوگ عموماً سنیوں کا کیتھلک عیسائیوں سے اور شیعوں کو پراٹسٹنٹوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ کیونکہ شیعوں نے سنت یعنی اُن احادیث کو جو پیغمبر صلعم کے حالات سے متعلق ہیں رد کر دیا ہے۔ مگر ان الفاظِ احادیث کو تسلیم کرتے ہیں جو روایت آنحضرت سے منسوب ہیں۔ چارڈن نے جو درحقیقت پراٹسٹنٹ تھا۔ اس کے بالکل برخلاف بیان کیا ہے غالباً اس کی وجہ وہ ظاہری مذہبی رسوم ہیں جو شیعوں میں پائی جاتی ہیں۔

مسلمانوں میں ڈِس سنٹر یعنی عوام کے عقائد سے اختلاف رکھنے والے بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے بانی کے نام پر سید احمدی کہلاتے ہیں۔ یہ ہندوستان کے وہابی ہیں اور بعض اوقات اسی نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔ بہت سے ہندوستانی مصنف اسی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً حاجی عبداللہ، حاجی اسمٰعیل اور اور لوگ جن کا ذکر بعد میں آئیگا۔

ہندوستان کے شعرا میں ایک بڑی تعداد ایسے مسلمانوں فلسفیوں یا صوفیوں کی بھی پائی جاتی ہے جن میں سے اکثر ولی مانے جاتے ہیں۔ نیز کچھ فقیر شاعر بھی ہیں۔ جن میں صرف فقرا ہی شریک نہیں بلکہ ایسے بھکاری بھی ہیں جو گلی کوچوں میں کاغذ کے ٹکڑوں پر لکھے ہوئے اپنے شعر بیچتے پھرتے ہیں۔ ان میں

سے مثال کے طور دہلی کے مکرّم (مرزا) اور کمترین (میاں) معروف بہ پیر خاں ہیں۔ کمترین اردوئے معلّا میں بذاتِ خود اپنی غزلیں دو دو پیسے کو بیچتا پھرتا تھا۔

ان بھکاری شاعروں کے ساتھ ساتھ ہم نیچ قوموں میں بھی شاعر پاتے ہیں۔ بعض تو ان میں سے پیشہ ور شاعر ہیں یعنی صاحب علم ہیں اور شعر وسخن میں اپنے تمام اوقات صرف کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو محض شوقیہ کہتے ہیں۔

ان کے علاوہ ایسے شاعر بھی ہیں جو صاحب تخت و تاج ہوئے ہیں اور جن کے اشعار کی نسبت "کلام الملوک ملوک الکلام" کہا گیا ہے۔ ان میں علاوہ گولکنڈہ کے تین بادشاہوں کے جن کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے، ابراہیم عادل شاہ بادشاہ بیجاپور، بدقسمت ٹیپو سلطان میسور۔ مغلوں میں شاہ عالم ثانی، اکبر شاہ ثانی، اور بہادر شاہ ثانی، اودھ کے بادشاہوں اور نوابوں میں آصف الدولہ غازی الدین حیدر اور واجد علی شاہ ہوئے ہیں۔

آخر میں ہمیں ہندوستان کے شعرا میں سے عورتوں کو مردوں سے الگ کرنا چاہیے۔ میں اپنے ایک خاص مضمون میں عورت شاعروں کا ذکر کر چکا ہوں[۵]

ان شاعر عورتوں میں سے جن کا ذکر میں نے پہلے نہیں کیا ایک شاہزادی خالہ ہیں۔ انھوں نے یہ تخلص اس لئے رکھا کہ وہ اپنے بھتیجے نواب عماد الملک رئیس فرخ آباد کے محل میں عام طور پر اسی نام سے پکاری جاتی تھیں، لیکن ان کا خطاب بدر النسا تھا۔

میں امتہ الفاطمہ کا بھی ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا تخلص صاحب ہے۔ مگر زیادہ تر جی صاحب یا صاحب جی کہلاتی ہیں اور اردو شعرا میں اپنی غزل کی وجہ سے مشہور ہیں۔ وہ ایک نامور شاعر مومن کی شاگرد ہیں۔ مومن شیفتہ کے بھی استاد ہیں جنھوں نے شعرا کا تذکرہ لکھا ہے اور جس کا حوالہ میں نے اکثر دیا ہے۔ علاوہ ان کے مومن کے اور بھی بہت سے شاگرد ہیں۔ صاحب کبھی دہلی اور کبھی لکھنؤ میں رہتی ہیں۔ معز اللہ خاں نے جو ایک مثنوی "قول غمیں" کے نام سے لکھی ہے، اس کی مخاطب یہی

---

۵ یہ مضمون "ریویو دی اورنیٹ" کے مئی نمبر ۱۸۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔

صاحب ہیں

ایک اور عورت شاعر جو باوجود ہندو نام کے اغلباً مسلمان ہے چمپا ہے۔ اس نے نواب حسام الدولہ کے حرم میں پرورش پائی اور قاسم نے اس کا نام اردو شعرا میں شمار کیا ہے۔

ایک معمولی طوائف جس کا نام فرح یا فرح بخش ہے وہ بھی اردو شعر کہتی ہے، شیفتہ نے ایک اور طوائف کا ذکر کیا ہے جس کا نام ضیا ہے اور عاشق نے ایک تیسری کا ذکر کیا ہے جس کا نام کنچن ہے۔

ایک چوتھی طوائف جس نے ہندوستانی زبان کی شاعری میں زیادہ شہرت حاصل کی ہے جان[۱] (میر یار علی جان صاحب) ہے، وہ اصل میں فرخ آباد کی رہنے والی ہے، مگر لکھنؤ میں توطن اختیار کر لیا ہے جہاں اسے ادبی کامیابی حاصل ہوئی۔ اسے بچپن سے موسیقی اور ہندوستانی شاعری اور فارسی کا شوق تھا۔ اس نے اپنی عمر ہندوستانی شاعری میں صرف کی اور کریم الدین صاحب تذکرہ اسے اپنا استاد سمجھتے ہیں اور شعر و سخن میں اس سے مشورہ کرتے ہیں۔ ۱۲۶۲ہجری (۱۸۴۶ء) میں اس کا دیوان لکھنؤ میں طبع ہوا جس نے بہت شہرت حاصل کی۔ اس کی تمام نظمیں زنانہ بولی میں ہیں۔ اس وقت اس کی عمر ۳۶ سال کی تھی۔

ایک ہندو عورت شاعر کا ذکر میں اور کرنا چاہتا ہوں۔ یہ نارنول کی رہنے والی ہے، اس کا نام رام جی اور تخلص نزاکت تھا۔ ہندوستانی تذکروں میں اس کی اعلیٰ قابلیت اور حسن و جمال کی بہت تعریف لکھی ہے۔ وہ ۱۸۴۸ء تک زندہ تھی۔

ان کے علاوہ دو تین اور عورت شاعروں کا ذکر بھی مناسب ہوگا۔ ایک تصویر ہے اور دوسری ثریا۔ ان کا ذکر باطن اور کریم نے کیا ہے۔ یاس جس کا نام میاں بانو تھا۔ حیدرآباد کی رہنے والی

---

[۱] گارساں دتاسی جیسے محقق سے یہ تعجب ہے کہ اس نے میر یار علی جان صاحب متخلص بہ جان صاحب کو طوائف سمجھا۔ حالانکہ خود نام بتا رہا ہے کہ یہ عورت کا نام نہیں ہو سکتا بہر حال مضمون کا یہ حصہ اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے

(اڈیٹر)

تھی اور فیض دہلوی کی شاگرد تھی۔ اس نے پندنامۂ عطار کا ترجمہ کیا ہے۔

ایک دوسری تقسیم ان شاعروں کی سنہ وار ہو سکتی ہے۔ اگرچہ یہ تقسیم زیادہ تر قابل لحاظ ہے۔ لیکن اُسی قدر مشکل بھی ہے۔ خاص کر قدیم شعرا کے متعلق زیادہ دشواری پیش آتی ہے۔ کیونکہ ان کے حالات صحیح طور سے معلوم نہیں ہو سکتے۔ سب سے اول ہندو شاعر ہیں[1]۔ گیارہویں صدی (۱۰۰۰ء) میں مسلمان شاعر مسعود سعد ہوا ہے جس کے متعلق این۔ بلینڈ (N. Bland) نے ایک مضمون جنرل ایشیاٹک بابت ۱۸۵۳ء میں لکھا ہے۔ بارہویں صدی میں چاند ہوا ہے جو راجپوتوں کا ہومر کہلاتا ہے۔ پیپا بھی اسی صدی کا شخص ہے جس کی نظمیں سکھوں کی ادی گرنتھ کا جز ہیں۔ تیرہویں صدی (تقریباً ۱۲۵۰ء) میں سعدی گزرے ہیں اور جیسا کہ بیان ہو چکا ہے انھوں نے اردو میں بھی شعر لکھے ہیں۔ بیجو باورا بھی مشہور شاعر اور کلاونت گزرا ہے۔ چودہویں صدی میں دلی کے امیر خسرو اور حیدرآباد کے نوری ہوئے ہیں۔

بلا شبہ ان کے علاوہ ہندوستان کے اور شعرا بھی ہیں جو ان صدیوں میں یا اس سے قبل گزرے ہونگے ممالک متوسط کے کتب خانوں میں بہت سی قدیم ہندی تصنیفات ہیں جن کا حال ابھی معلوم نہیں ہوا ہی بہت سے ایسے گیت بھی موجود ہیں جن سے اُس زمانے کا پتہ لگتا ہے۔ جب کہ ہندوستانی زبان بن رہی تھی۔

سولہویں صدی میں جدید فرقوں کے سب سے قدیم بانی پیدا ہوئے جن کی مذہبی زبان ہندی تھی اور جو اس زبان میں بھجن اور اخلاقی نظمیں تصنیف کرتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ قابل لحاظ کبیر ہیں جو سنسکرت کے سخت مخالف تھے۔ اُن کے شاگرد سُرت گوپال داس مصنف سُکھ ندان اور دھرم داس مصنف امرل ہوئے ہیں۔ نانک اور بھگو داس مشہور و معروف ہیں اور اُن کی نسبت میں اس کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا جو پہلے لکھ چکا ہوں۔ لالچ، بھگوت کا مصنف ہے اس نے یہ کتاب پچھم کی ہندوستانی میں لکھی ہے وغیرہ وغیرہ۔

---

[1] سب سے قدیم ہندی شاعروں کا زمانہ صحیح طور سے معلوم نہیں ہو سکتا۔ تاہم میں شنکر اچاریہ کا نام لے سکتا ہوں جو سنسکرت کا شاعر تھا۔ اور رام سکتا کے نام سے معروف تھا۔ یہ نویں صدی میں ہوا ہی اور ایسا معلوم ہوتا ہی کہ اس نے ہندی میں شعر کہے ہیں۔

سولھویں صدی میں ہندوں میں سکھ دیو ہوا ہے۔ جس کی حال میں تذکرہ نویس ہریاداس نے خاص مضمون لکھا ہے۔ نابھاجی بھی اسی زمانہ کا شخص ہے۔ یہ ان گیتوں کا مصنف ہے جو بھگت مل کا اصلی متن ہیں۔ ولبھا اور دادو اپنے اپنے فرقوں کے سردار اور مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ بہاری، ست سئی کا مشہور مصنف گزرا ہے گنگاداس ماہر فن معانی و بلاغت ہوا ہے۔ اور ایسے ہی اور بہت سے ہوئے ہیں۔

شمالی ہند کے مسلمانوں میں علاوہ اور لوگوں کے ایک تو ابوالفضل اکبر کے وزیر ہیں اور دوسرے بایزید انصاری جو روشنائی یا جلالی فرقہ کے سردار تھے۔

دکن کے شعرا میں مفصلہ ذیل نام پائے جاتے ہیں۔ افضل (محمد) جس کا تذکرہ نویس کمال لکھتا ہے کہ "اس کا طرز بیان شستہ نہیں کیونکہ اس زمانے میں جبکہ اس نے لکھنا شروع کیا، ریختہ مقبول نہیں ہوا تھا اور اسی سے اسے مجبوراً دکھنی میں لکھنا پڑا" محمد قلی قطب شاہ، بادشاہ گولکنڈہ جو ۱۵۸۲ء سے ۱۶۱۱ء تک برسر حکومت رہا اور اس کا جانشین عبداللہ قطب شاہ جو ہندوستانی ادب کا مربی و سرپرست تھا

سترہویں صدی وہ زمانہ ہے جس میں خاص کر دکن میں اصل اردو شاعری کا فروغ شروع ہوا اور زبان کا استعمال باقاعدہ ہونے لگا۔ ہندی شعرا میں صرف سورداس، تلسی داس اور کیشوداس کے ناموں پر اکتفا کروں گا۔ یہ جدید ہندوستان کے مقبول شاعر ہیں اور جن کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ "سورداس سورج ہے، تلسی داس چاند اور کیشوداس ستارے دوسرے شاعر صرف جگنو ہیں جو ادھر ادھر چمک جاتے ہیں"۔

اردو شعرا میں حاتم جن کا ذکر پہلے آچکا ہے آزاد (فقیر اللہ) جو اگرچہ حیدرآبادی تھے۔ مگر دلی میں رہتے تھے اور ان کی نظم نے وہیں شہرت حاصل کی۔ جیون (محمد) جو متعدد مذہبی کتب کے مصنف ہوئے ہیں۔

دکنی شعرا میں یہ لوگ ہوئے ہیں۔ ولی جسے بابائے ریختہ کہا جاتا ہے۔ ان کے استاد شاہ گلشن احمد گجراتی تاناشاہ جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، شاہی بھاگ نگری اور مرزا ابوالقاسم جو تاناشاہ کے عہدہ داروں میں سے

سے تھے، عوری یا ابن نشاطی (غالباً یہ دونوں ایک ہی صاحب کے نام ہیں) مصنف پھول بن؛ غواص یا غواصی مصنف طوطی نامہ؛ محقق، دکن کا ایک بہت قدیم شاعر جس کا کلام ریختی میں ہے اور ہندوستانی ریختی سے بہت کچھ ملتا جاتا ہے، خاور نامہ کا مصنف ہی اس کا خلاصہ میں اپنی تاریخ ادب اردو میں دے چکا ہوں اعجاز (محمد) اور بہت سے اور۔

اٹھارہویں صدی کے ان تمام ہندوستانی شاعروں کا ذکر جنھوں نے اپنے ہم وطنوں میں شہرت و امتیاز حاصل کیا ہی بہت طویل ہوگا، ہندی شاعروں میں چند کا ذکر کرتا ہوں۔ گینتی اُس نے ہندوؤں کے مختلف فلسفیانہ عقاید پر ایک رسالہ لکھا ہی۔ بیر بھان یہ مشہور فرقہ سادہ کا بانی اور ایک مشہور مذہبی نظم کا مصنف ہوا ہی۔ رام چرن، یہ ایک فرقہ کا بانی جو اسی کے نام سے موسوم ہی اور مذہبی بھجنوں کا مصنف ہی۔ شیو نراین، یہ بھی ایک فرقہ کا بانی ہے اور ہندی نظم میں گیارہ کتابوں کا مصنف ہی۔ وہ ابتدا میں بجائے معمولی گنیش کی حمد و ثنا کے رشیوں کی پناہ سے آغاز کرتا ہے۔

اردو شاعروں میں میں صرف چند نام لوں گا۔ سودا، میر اور حسن جو گزشتہ صدی کے تین نامور شاعر گزرے ہیں۔ جرأت، آرزو، درد، یقین، فغاں، امجد دہلی کے، امین الدین بنارس کا اور عاشق غازیپوری۔ دکھنی شعرا میں قابل ذکر یہ ہیں۔ حیدر شاہ معروف بہ مرثیہ گو، کیونکہ وہ اپنے مرثئے خود پڑھتے تھے منجملہ اور چیزوں کے ہم اس شاعر کے کلام میں متعدد ایسی نظمیں پاتے ہیں جن کا ارتقا ولی کے دیوان میں نظر آتا ہے۔ یہ نظمیں مخمس ہیں۔ وہ ایک منظوم کتاب تحفۃ الصبیان کا مصنف بھی ہے اس میں کئی باب ہیں اور ہر باب کی بحر جدا ہے اور باب کے شروع میں بحر کا نام لکھ دیا گیا ہے۔ سراج اورنگ آبادی (سنہ وفات تقریباً ۱۷۵۴ء) اور عزلت سورتی جو دکن کے مشہور شعرا میں ہو گئے ہے (سنہ وفات ۱۷۵۱ اور ۱۷۵۲ کے درمیان)

انیسویں صدی اور زمانۂ حال کے مشہور ہندی مصنفین میں ایک تو بختاور ہے جس نے جینی عقائد کی تشریح و تفصیل نظم میں لکھی ہے دوسرا ڈھا رام (سیرت نویس) فرقہ رام سینہی کا سردار اور تیسرا اُس کا جانشین چیتر داس ہے۔

اردو میں صہبائی اور کریم نے ان شعرا کے نام لکھے ہیں۔ مومن دہلوی جو بہت پر گو اور فصیح

شاعر تھا (سنہ وفات ۱۸۵۲ء) ان دونوں صاحبوں کی رائے میں اس کا کلام بے نظیر ہے۔ نصیر (سنہ وفات ۱۸۴۲ء، ۱۸۴۳ء)؛ آتش (سنہ وفات ۱۸۴۶ء) یہ سب صاحب دیوان ہیں اور مقبول شعرا میں سے ہیں، مول چند، جس نے شاہنامہ کا ملخص نظم میں کیا ہے۔ ممنوں ہم عصر شعرا میں بہت مشہور و معروف ہیں اور ان کے علاوہ کئی اور ہیں جن کا ذکر میں اپنے ابتدائی خطبہ میں کر چکا ہوں۔

دکھنی شعرا میں صرف کمال حیدرآبادی اور عبدالحق مدراسی کے نام کافی ہیں۔

جس طریقہ سے ہندوستانی تذکرہ نویس شعرا کا ذکر کرتے ہیں اگر ہم اُس پر غور کریں تو آسانی سے اس کی تین تقسیمیں ہو سکتی ہیں۔ وہ شاعر جن کا وہ محض ذکر کر دیتے ہیں؛ وہ شعرا جن کا ذکر وہ ادب سے کرتے ہیں؛ اور وہ شاعر جن کا ذکر بہت ادب و احترام اور تعریف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ پہلے درجہ میں وہ لوگ ہیں کہ جن کے متعلق کوئی تفصیلی ذکر نہیں ہوتا اور بعض اوقات صرف نام، تاریخ ولادت اور کچھ اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ وہ شاعر ہیں جو صاحب دیوان نہیں اور جن کی صرف چند ہی غزلیں ہیں یا جنھوں نے بعض طویل نظمیں مختلف طور پر لکھی ہیں مگر کسی نام سے موسوم نہیں۔ دوسرے درجہ میں ان لوگوں کا شمار کرتا ہوں جو صاحب دیوان یا کلیات ہیں۔ ان اصطلاحوں کی تشریح میں بعد میں کروں گا، تیسرا درجہ اُن مصنفین کا ہے جن کی نظم یا نثر کی تصانیف کے خاص نام ہیں۔ اگر وہ ہندو ہیں تو ان کتابوں کے نام عموماً سنسکرت میں ہوتے ہیں اور مسلمان ہیں تو فارسی عربی میں۔

ہندوستانی میں مختلف قسم کی نظمیں مختلف ناموں سے موسوم ہیں۔ یعنی الفاظ معانی پر غالب ہیں۔ غزل میں چھ سے بارہ تک شعر ہوتے ہیں۔ سب کا قافیہ ایک ہی ہوتا ہے اور پہلے دو مصرعوں میں قافیے کا ہونا لازم ہے۔ مضمون کے لحاظ سے کوئی تعین نہیں ہو سکتا۔ یہ ظریفانہ اور سنجیدہ ہر قسم کی ہوتی ہیں اور اکثر عاشقانہ اور تصوفانہ ہوتی ہیں۔ یہ پٹرارک اور شکسپیر کی طرز پر ایک قسم کی سانٹ ہوتا ہے۔ شکسپیر نے اس مشہور اطالوی شاعر (پٹرارک) کی تتبع میں سانٹ لکھے ہیں اور حسن اور شیرینی میں اس سے کسی طرح کم نہیں، لیکن اُس کے ڈراموں کے مقابلہ میں وہ زیادہ مشہور نہ ہونے پائے۔ قصیدہ بھی اسی قسم کی نظم ہے لیکن یہ طویل ہوتا ہے اور کبھی مدح میں اور کبھی ہجو میں اور بعض اوقات کسی دوسرے مضمون پر۔

مثنوی وہ نظم ہے جس کے دونوں مصرعے مقفی ہوتے ہیں اور وہ ہر قسم کے مضمون پر ہوتی ہے بعض وقت یہ بہت مختصر ہوتی ہے اور بعض وقت بہت طویل۔ یعنی کبھی دو تین صفحے کی اور کبھی اس کی طوالت ہزار صفحے تک پہنچ جاتی ہے کبھی قصہ کہانی ہوتی ہے اور کبھی اخلاقی یا مذہبی نظم۔ ہندوستانی شعرا نے اس میں لطیف و شدید، سنجیدہ و غیر سنجیدہ ہر قسم کے مضامین لکھے ہیں۔

ان کے علاوہ مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مسبع، مثمن اور معشر ہیں۔ جن میں بہ ترتیب تین چار پانچ چھ سات آٹھ اور دس مصرعے ہوتے ہیں۔ یہ مرثیے، تہنیت اور مبارکباد یا دوسرے مضامین پر مشتمل ہوتے ہیں۔

بعض نظمیں ایسی ہیں جن کے نام اور مضمون میں تفاوت نہیں پایا جاتا مثلاً ساقی نامہ' نام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظم شراب نوشی کے متعلق ہوگی لیکن بعض اوقات یہ مختلف مضامین پر ہوتا ہے۔ مثلاً حیدر (حیدر بخش) کا ساقی نامہ جو حضرت علی کی منقبت میں ہے۔

تقریباً یہی حال ہندی شاعری کا ہے۔ نظم کے خاص ناموں کو مضمون سے کچھ زیادہ تعلق نہیں ہوتا مثلاً "پد" میں ہر قسم کا مضمون آجاتا ہے اور "بیٹہ" جو ہولی اور بیاہ شادی دونوں کے گیتوں کے لئے آتا ہے شادی کے گیتوں کا خاص نام بعض اوقات بدہوا ہوتا ہے۔

مسلمان کی شاعری خواہ کیسی ہی مختصر ہو، اس میں کچھ ایسا صوفیانہ رنگ ہوتا ہے کہ فوراً پہچانی جاتی ہے۔ فارسی کی طرح کی ہندوستانی کی شاعری میں بھی مرد کے پردے میں عورت کا حسن بیان کیا جاتا ہے اس کے برخلاف ہندوستانی کی شاخ ہندی میں عورت اپنا عشق ایک نوجوان کی نسبت ظاہر کرتی ہے اور عشقیہ اشعار اس کی زبان سے ادا کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات اردو میں بھی یہ پایا جاتا ہے اور اس صورت میں اس شاعری کو ریختہ کہتے ہیں۔ انشاء اللہ خاں نے اس قسم کی شاعری کو اس صدی کے آغاز میں رواج دیا۔

اردو میں بھی فارسی کی وہی قسمیں اور وہی بحریں ہیں جو فارسی میں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دو قسمیں صرف ہندوستانی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ایک مکری اور دوسری پہیلی، جن کا ذکر میں بعد

میں کروں گا۔

عربی میں اول اول دیوان کا نام نظموں کے ایک معمولی مجموعہ کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً دیوان فرید اور دیوان امرُالقیس لیکن اب عربی نیز مشرق کے مسلمانوں کی دوسری زبانوں جیسے ہندُستانی پشتو، فارسی، ترکی میں غزلوں کے ایسے مجموعے کا نام ہے جو بلحاظ مضمون قافیہ کے آخری حرف کی رعایت سے حروف تہجی کی ترتیب سے مرتب ہو۔ علاوہ غزلوں کے اس میں دوسری نظمیں بھی شریک کردی جاتی ہیں۔ کلیات مصنف کے کئی دیوانوں اور تمام متفرق نظموں کے مجموعے کا نام ہے۔ ہندی شاعری میں یہ دو اصطلاحیں مستعمل نہیں ہیں۔ مثلاً دوہروں، کبتوں اور شلوکوں کے مجموعے کو (جو دیوناگری میں لکھے جاتے ہیں) کبھی دیوان یا کلیات نہ کہیں گے۔

کلیاتوں یا دیوانوں کے خاص خاص نام بہت کم بلکہ شاذ ہوتے ہیں۔ صرف چند ہی ایسے ہیں جن کے خاص نام ہیں۔ مثلاً اختر (واجد علی شاہ) موجودہ بادشاہ اودھ کے دیوان کا نام فیض بنیان ہے۔ اور جوش (احمد حسن خاں) کا دیوان گلدستۂ سخن کہلاتا ہے۔ رشک کے دو دیوان نظم مبارک اور نظم گوہر (؟) کے نام سے موسوم ہیں اور کلیات تپش کا نام گلزار مضامین ہے۔

چھوٹی چھوٹی نظمیں جو ان مجموعوں میں پائی جاتی ہیں وہ زیادہ تر عاشقانہ اور صوفیانہ ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان کے مصنف اکثر مسلمان ہوتے ہیں اور وہ حسن جاودانی (باقی) اور حسن مخلوق (فانی) میں گڈمڈ کر دیتے ہیں جو ہماری نظروں میں خلاف اتقا معلوم ہوتا ہے۔ اُنھیں خدا، عورت یا مرد کے چہرے میں نظر آتا ہے اور اس لئے بعض اوقات اعلیٰ درجہ کے روحانی اشعار کے ساتھ ساتھ کم درجہ کا سوقیانہ بلکہ فحش کلام بھی پایا جاتا ہے۔ جہاں تک کہ مروّجہ یورپین اور مسیحی آداب نے اجازت دی میں نے دیوان ولی کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا ہے۔ نیز میری کتاب ”تاریخ ادب اردو“ اور ”ہندوستانی گیتوں“ میں بھی بہت سی غزلوں کے ترجمے آ گئے ہیں۔ اِن سے اس قسم کی شاعری کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان میں سے بعض غزلیں نہایت اعلیٰ درجے کی ہیں اور میری رائے میں پنڈار اور انیک راین کے کلام بلکہ حافظ کی غزلوں کی برابری کرتے ہیں جن کی دنیا میں اس قدر شہرت ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ باقی

کی ترکی غزلوں سے کہیں بہتر ہیں۔

بڑا نقص ان میں یہ ہے کہ چند ہی مضمون ہیں جن کا طرح طرح سے اور اکثر ایک ہی قسم کے الفاظ اور جملوں میں بار بار اعادہ ہوتا ہے اور اس سے جی اکتا جاتا ہے۔

ایسے اشعار بکثرت ہیں جن میں تکلف اور آورد پائی جاتی ہے اور بٹلر کا یہ شعر مشرقی شاعروں پر پورے طور سے صادق آتا ہے۔

"جو لوگ مقفیٰ اشعار لکھتے ہیں انھیں ایک مصرع کی خاطر دوسرا مصرع بنانا پڑتا ہے"

چند ممتاز اور مقبول دیوانوں کے سوا، دوسرے دیوانوں کا پڑھنا ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

دوسرا نقص ان غزلوں میں یہ ہے کہ ان میں عموماً ابہام پایا جاتا ہے اور اہل مشرق اُسے حُسن سمجھتے ہیں اور اس کی بڑی قدر کرتے ہیں۔

ہندوستانی دواوین میں ولی کا دیوان بہت مشہور ہے۔ باوجود اس کے ممالک مغربی و شمالی میں آج کل اسے بہت کم لوگ پڑھتے ہیں اس لئے نہیں کہ وہ دکنی زبان میں ہے بلکہ زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ اس کا طرز بیان قدیم ہے۔ سودا۔ میر درد، جرأت اور یقین کے دیوانوں کا یہ حال نہیں یہ اس کے مقابلے میں زیادہ جدید ہیں اور اب تک مقبول ہیں۔

ہم عصر شعرا کے دیوانوں میں آتش، ذوق، نوید اور نظیر کے دیوان بہت مشہور ہیں۔

دیوانوں کے آغاز اور خاتمہ پر جو نظمیں ہوتی ہیں وہ مختلف قسم کی ہوتی ہیں اور ان کے متعلق میں "ہندوستانی ادب کی تاریخ" میں ذکر کر چکا ہوں۔

طویل مثنویوں میں یا کسی خاص مضمون کا ذکر ہوتا ہے یا کوئی تاریخی واقعہ بیان کیا جاتا ہے یا بعض اوقات پورا قصہ منظوم کر دیا جاتا ہے۔ اکثر یا تو قصے کہانیاں ہوتی ہیں یا کم و بیش تاریخی واقعات یا بالکل فرضی اور خیالی قصے۔ لیکن عموماً یہ ہوتا ہے کہ شاعر اپنے طور پر کسی ایسے قصے کو نظم کر دیتا ہے جو پہلے سے مشہور ہے۔ اس قسم کی بہت سی ضخیم نظمیں موجود ہیں اور بعض ان میں سے قابل قدر ہیں۔ بعض شاعروں نے کئی کئی مثنویاں لکھی ہیں اور ہندوستانی فارسی اور ترکی میں ایسے شاعر بھی ہیں جنہوں نے پانچ پانچ اور سات

سات مثنویاں لکھی ہیں ۔ چنانچہ بعض مثنویوں کے مجموعے خمسے اور ہفتے کہلاتے ہیں، گویا وہ مثنویوں کے دیوان ہیں ۔ ان میں سے زیادہ مشہور نظامی اور امیر خسرو کے خمسے اور جامی کا ہفتہ ہے جو استعارۃً ہفت اورنگ بھی کہلاتا ہے ۔

بعض قصے ایسے مقبول ہوئے ہیں کہ انھیں اکثر شاعروں نے نظم کیا ہے اور مثنویوں کے مجموعوں میں وہ ضرور پائے جاتے ہیں ۔ ان میں زیادہ تر مشہور مشرق کے عاشقوں کے قصے ہیں مثلاً یوسف زلیخا، فرہاد شیریں، مجنوں لیلیٰ اور وامق و عذرا ۔

بعض بہادر اور نامور لوگوں کے قصے بھی ہیں جو بہت مبالغہ آمیز ہیں مثلاً سکندر، رستم، حمزہ، حاتم طائی بہرام گور (یہ نام اس کا اس لئے پڑ گیا تھا کہ اُسے گورکے شکار کا بہت شوق تھا)

ہندوستانی میں یہ اسلامی قصے خوب خوب بیان ہوئے ہیں اور اُن میں مقامی رنگ بھی آگیا ہے جس سے اور لطف پیدا ہو گیا ہے ۔

اکثر مصنفین نے اپنی نظموں میں یہ بیان کیا ہے کہ یہ فارسی کے ترجمے ہیں ۔ یہ بھی ایک طریقہ بیان ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُن فارسی تصانیف پر مبنی ہیں جنھیں مشرق میں خاص شہرت حاصل ہے ۔ اس سے قبل ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ہندوستانی کے رواج سے پہلے ہندوستان کے مسلمان اور بعد میں ہندو بھی ایک زمانہ دراز تک فارسی لکھتے پڑھتے تھے ۔ باوجود رواج کے ہندوستانی میں لکھتے وقت مصنفین بہت لیس و پیش کرتے تھے اور اس معمولی زبان کے استعمال کے متعلق بہت سے عذر کرتے تھے اور یہ سب کچھ ہونے کے بعد بھی وہ اپنی نئی تالیفات کا تعلق فارسی تصانیف سے قایم کرنے کی کوشش کرتے تھے جب ان ترجموں کو غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اکثر وہ ترجمہ تو کیا اصل کی نقل بھی نہیں ہیں بلکہ اسی مضمون پر جداگانہ کتابیں ہیں اور ظاہری ترتیب اور بنیادی امور میں دونوں اصل سے مختلف ہیں

علاوہ شاعری کے دوسری کتابوں کا بھی یہی حال ہے مثلاً آرائش محفل جو سبحان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ کا ترجمہ خیال کی جاتی ہے ۔ ہندوستان کی تاریخ اور جانگاری (مقامات کا تذکرہ) ہے اور محض فارسی کتاب کا ترجمہ یا خلاصہ نہیں ہے ۔

میں نے "یوسف زلیخا" کے چھ مختلف نسخے دیکھے ہیں۔ ایک امین کا جو سنہ ۱۶ء میں لکھا گیا، دوسرا تپش کا جو مصنف نے قید خانے میں تصنیف کیا۔ تیسرا فدوی لاہوری کا جس پر اس کے حریف اور ہم عصر شاعر میر فتح علی نے بہت کچھ نکتہ چینی کی ہے اور "قصہ بوم و بقال" لکھ کر فدوی کے باپ کے پیشے پر طعن کیا ہے چوتھا مجیب کا جو زمانہ حال کا شاعر ہے۔ پانچواں (مہدی علی) عاشق کا جو خمسہ کا ایک حصہ ہے۔ اور چھٹا نسخہ بمبئی میں سنہ ۱۸۴۷ء میں "عشق نامہ" کے نام سے طبع ہوا۔

ہندوستانی میں "لیلیٰ مجنوں" کے پانچ نسخوں کا مجھے علم ہے ایک تاج علی کا، دوسرا اعظم دہلوی کا جو شاہ جیلان کے نام سے بھی مشہور ہے۔ ہوس نے بھی ایک لیلیٰ مجنوں شاہ نامہ کی بحر میں لکھی ہے یہ آصف الدولہ نواب اودہ کے رشتہ داروں میں سے تھے اور رضی اور رضا اور رسا کے ناموں سے بھی مشہور ہیں۔ چوتھا ولا کی تصنیف ہے جو امیر خسرو کی فارسی تصنیف کے تتبع میں ہے۔ پانچواں ایک ترجمہ ہے جس کا ذکر ڈاکٹر سپرنگر نے کیا ہے اور یہ ان سب سے قبل کا ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے بہرام گور کے قصے پر ہندوستانی میں تین کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک حیدری کی ہے جس کا نام "ہفت پیکر" ہے جو نظامی کی اصل فارسی تصنیف کا نام ہے۔ دوسری تابی (؟) کی ہے جو گولکنڈہ کا رہنے والا تھا اس کا سنہ تصنیف سنہ ۱۷۰۰ء ہے ایک حقیقت بریلوی کی ہے جو سنہ ۱۸۱۰-۱۱ء میں لکھی گئی، اس کا نام ہشت گلزار ہے۔ بظاہر یہ ہشت بہشت کی مناسبت سے ہے لیکن بجائے اس کے ہفت گلزار نظامی کی ہفت پیکر اور ہاتفی کی ہفت منظر کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہوتا۔ ہاتفی نے یہ نام اس لئے رکھا ہے کہ بہرام گور شاہ ایران یزدجرد کے بیٹے کے سات بیویاں تھیں اور سات مختلف باغوں میں الگ الگ رہتی تھیں۔

سکندر کے متعلق ہندوستانی میں مجھے دو قصوں کا علم ہے۔ ایک آگرے کے اعظم کا ہے جو اس نے نظامی کے سکندر نامے کے تتبع میں لکھا ہے۔ دوسرا نکہت دہلوی کا۔ یہ بھی سکندر نامہ ہی کی تقلید میں لکھا گیا ہے۔

حاتم طائی کا قصہ ہندوستانی میں بھی ایسا ہی عام ہے جیسا فارسی میں۔ جہاں تک میرا علم ہے یہ قصہ

ہندوستانی میں حیدری، سراج اور گوبند ناتھ نے لکھا ہے۔

شاہ و درویش کا قصہ ہندوستانی فارسی اور ترکی تینوں زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ ہندوستانی میں (بینی نراین) جہاں کا قصہ زیادہ تر مشہور ہے

امیر حمزہ (عم حضرت صلعم) کا عجیب و غریب قصہ بھی کئی صاحبوں نے لکھا ہے ان میں سے دو کا مجھے علم ہے ایک تو عاشق کا ترجمہ ہے جس کی تفصیل میں نے کسی دوسری جگہہ لکھی ہے۔ دوسرا غالب لکھنوی کا۔ جو کہا جاتا ہے کہ فارسی کا ترجمہ ہے اور کلکتہ میں چھپا ہے۔

ان قصوں میں سے جو مشرق کے مشاہیر کے متعلق لکھے گئے ہیں میں صرف ایک کا اور ذکر کروں گا یعنی ہُرمز بن شاہ پور شاہ ایران کا قصہ جو ہُرمز و بن شاہ پور کے نام سے مشہور ہے۔ یہ وہی شخص ہے جس نے مذہب مانی کو فروغ دیا۔ اہل مشرق مانی کو بہت بڑا مصوّر اور شعبدہ باز خیال کرتے ہیں۔

علاوہ ان قصوں کے جو اسلامی مشرق میں مقبول و معروف ہیں، چند ہندی قصّے بھی جنہیں ہندوستانی شعرا نے فراموش نہیں کیا۔ مثلاً شکنتلا کا دلفریب قصّہ، جو ڈراما کے تتبّع میں نہیں لکھا گیا بلکہ مہابھارت کے اصل قصے پر لکھا گیا ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ ہندی سے کیا ہے (دیکھو ریویو اورنٹیل بابت ۱۸۵۲ء)

مجھے اس قصے پر ہندوستانی میں چار کتابوں کا علم ہے۔ ایک نواز کا جسے فرخ سیر نے کبیشر کا خطاب دیا دوسرا کاظم علی جوان کا۔ تیسرا شکنتلا ناٹک جو کلکتہ میں ۱۸۰۱ء میں شائع ہوا اور ڈاکٹر گلکرسٹ کے رومن طریقے پر لاطینی حرفوں میں طبع ہوا۔ چوتھا غلام احمد کا جو ۱۸۴۹ء میں کلکتہ میں چھپا اور جس کا خلاصہ جرنل ایشیاٹک بابت ۱۸۵۰ء میں شائع ہوا اور پانچواں ایک پارسی مصنف (بومن جی دوساجی) کا جس کا ذکر میں دوسری جگہہ کر چکا ہوں۔

اسی قسم کے قصوں میں ایک پدماوتی کا قصّہ بھی ہے وہ بادشاہ سیلون کی بیٹی تھی اور اس کی شادی چتوڑ کے راجہ رتن سے ہوئی تھی جسے علاء الدین نے ۱۳۰۳ء میں شکست دی تھی۔ ہندوستان کے قصہ نویس جائسی نے اس قصے کو نظم میں آب و تاب سے لکھا ہے اور اس قصّے میں فاتح کے ہاتھوں سے بچنے کے لئے پدماوتی ایک ہزار عورتوں کے ساتھ ستی ہو جاتی ہے۔ لیکن برخلاف اس کے جبل نے جو ہندی قصے کا مصنف ہے، اسے آگ کے نذر نہیں کیا بلکہ وہ اسلامی فوج کے سردار کو اس طرح دھوکا دیتی ہے

کہ سات پالکیاں ساتھ لے کر جاتی ہے جس میں ٹرائے کے مشہور گھوڑے کی طرح، راجپوت سپاہی سوار تھے اور وہ بے خبری میں مسلمانوں پر جا پڑتے ہیں اور انھیں شکست دے کر بھگا دیتے ہیں۔

دو اور ہندوستانی شاعروں نے بھی جن کا نام عبرت اور عشرت ہے اس بہادر راجپوت رانی کے قصّے کو نظم کیا ہے۔

کرشن کا قصّہ متعدد ہندوستانی نظموں میں بیان کیا گیا ہے ان سب میں بہتر لالچ کی کتاب ہے جو فرانسیسی میں بھی ترجمہ ہو گئی ہے۔ اس پر بھوپتی اور کرشن داس اور لال نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ لال کی کتاب پریم ساگر ہندی ادب میں بہت قابل قدر کتاب ہے۔ اس میں نثر کے ساتھ نظم بھی جا بجا پائی جاتی ہے۔ جس سے کتاب کا لطف بڑھ جاتا ہے۔

رام کے قصّے نے والمیکی کی بدولت صرف سنسکرت ہی میں شہرت حاصل نہیں کی بلکہ ہندی میں بھی متعدد شاعروں نے اس کی داد دی ہے جن میں سے ایک تلسی داس ہے۔ تلسی کی راماین ۱۵۸۰ء سے قبل کی ہے اور اب بھی اہل ہند میں غالباً والمیکی سے زیادہ مقبول ہے۔ کیشو داس نے اس قصّے کو رامچندریکا کے نام سے کہا ہے۔ یہ گویا دوسری راماین ہے۔ جس کی شرح جھگن لال نے لکھی ہے۔ سورچند اور دوسرے بہت سے ہندی شاعروں نے بھی اپنا زور قلم دکھایا ہے یہ قصّہ گو رسیو کی تصنیف اور ایم نوشے کے ترجمہ کی بدولت یورپ بھی پہنچ گیا ہے۔

اگرچہ ان تمام قصّوں کی بنیاد تاریخ ہے تاہم تخیل کی گلکاری سے خالی نہیں۔ اب ہم اُن فسانوں کا ذکر کرتے ہیں جو بالکل خیالی ہیں۔ ان میں ایک کامروپ کا قصّہ ہے۔ مختلف ہندوستانی مصنفوں نے اسے نظم اور نثر دونوں میں لکھا ہے۔ نظم میں تحسین الدین، ضیغم، آرزو، حسن، سراج نے طبع آزمائی کی ہے۔ نثر میں کندن لال نے اس قصّے کو لکھا ہے جس کا نام "دستور ہمّت" یا "ہمّت" ہے اور یہ ایک فارسی شاعر کی طرف اشارہ ہے جس کی تنقید مصنف نے کی ہے۔ کہتے ہیں کہ سندباد کا قصہ اسی سے لیا گیا ہے جو الف لیلہ میں داخل ہو گیا نیز سینٹ بریڈین کے قصّے کی اصل بنیاد بھی یہی ہے جو میری آف فرانس نے لکھا ہے۔ ہندوستانی کے مشہور خیالی فسانے یہ ہیں۔ نل و دمینتی (نل ودمن) جو یورپ میں زیادہ تر "نہابھار

کے نلوس کے" نام سے مشہور ہے، اس قصّے کو بہت سے ہندوستانی شاعروں نے لکھا ہے۔ لیکن سب میں مشہور ہندی کے نامور شاعر سورداس کی نظم ہے۔ اس کے بعد بنگال کے میر علی کی تصنیف ہے جو "بہارِ عشق" کے نام سے موسوم ہے۔ حال میں لکھنؤ میں اسی قصّے کو احمد علی نے بھی لکھا ہے۔

گلِ بکاولی ایک پر لطف قصّہ ہے اس میں ہندی تعلیم کے ساتھ قرآن کی تعلیم بھی ملی جلی پائی جاتی ہے یہ بات ہندوستان میں عام ہے اور جدید ہندوستانی ادب کی نئی خصوصیت ہے۔ اس قصّے کا تذکرہ میں نے نہال چند کی کتاب سے جس میں نظم و نثر دونوں پائی جاتی ہیں، جرنل ایشیاٹیک بابت ۱۸۳۶ء میں کیا ہے۔ اسی کو نسیم نے نظم میں لکھا ہے جو آگرہ کالج میں پروفیسر تھا۔ یہ مثنوی گلزار نسیم کے نام سے مشہور ہے۔ ایک اور شاعر نے اسی قصّے کو نظم کیا ہے اور اس کا تاریخی نام "تحفۂ مجلس سلاطین" رکھا ہے اس سے ۱۱۵۱ ہجری (۳۹-۱۷۳۸ء) نکلتا ہے۔ ریحان نے بھی ایک مثنوی "خیابانِ ریحاں" کے نام سے لکھی ہے یہ نظم دوسروں کی نسبت زیادہ مشہور ہے۔ یہ چالیس ابواب میں ہے اور ہر باب کا نام اس نے "گلگشت" رکھا ہے۔ ڈاکٹر سپرنگر کو لکھنؤ کے توپخانے میں اس قصّے کا ایک قلمی نسخہ ملا جو دکھنی زبان میں تھا اور ۱۰۳۵ھ (۲۶-۱۶۲۵ء) میں تصنیف ہوا تھا۔

ہیر اور رانجھا۔ یہ پنجابی قصّہ ہے جسے میں نے ایک نثر کی کتاب سے ترجمہ کیا۔ اس میں جگہ جگہ اردو فارسی اشعار بھی ہیں مصنف اس کا مقبول ہے یہ حال کا شاعر ہے۔ اسی نام کا ایک دوسرا شاعر بھی ہوا ہے لہٰذا دونوں میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔

سسی پنوں۔ یہ قصّہ بھی ہیر رانجھے سے ملتا جلتا ہے اُسے بھی مقبول نے نثر میں لکھا ہے اور محبت نے اسے نظم کیا ہے اور ہندو مصنفین اندرجیت منشی اور انت پرکاش وغیرہ نے فارسی میں لکھا ہے۔

پھولبن اور اس کے عاشق تیلا شاہ کا قصّہ۔ اسے کئی دکنی شاعروں نے نظم کیا ہے۔ محمد ابراہیم مترجم دکھنی انوار سہیلی کے قول کے بموجب غوری کی نظم بہت مشہور ہے۔

گل وصنوبر۔ مجھے اس قصّے کے چھ نسخوں کا علم ہے ایک احمد علی کا جو خمسہ کا حصّہ ہے۔ دوسرا نیم چند کھتری کا۔ تیسرا "گلشن ہند" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نام اور کتابوں کا بھی ہے۔ چوتھا دکھنی زبان میں جس کا

ایک نسخہ نظام کے کتب خانے میں ہے۔ پانچواں جو لکھنؤ میں ۱۸۴۵ء میں طبع ہوا۔ چھٹا جو کلکتہ میں ۱۸۴۷ء میں چھپا اور جسے مؤلف نے فارسی کا ترجمہ بتایا ہے۔

چار درویشوں کا قصہ۔ یہ قصہ امّن نے لکھا ہے جس کا نام "باغ و بہار" ہے۔ یہ تاریخی نام ہے یہ کتاب ایسٹ انڈیا کے ملکی اور فوجی عہدہ داروں کے نصاب تعلیم میں داخل ہے۔ اس پر دوسرے ہندوستانی مصنفین نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں سے ایک عطا حسین تحسین ہے۔ اس کتاب کا نام نوطرز مرصع ہے۔

گرو پرمارتھم کا قصہ۔ تامل میں مشہور قصہ ہے۔ لیکن ہندوستانی میں لکھا گیا ہے اور ۱۸۴۸ء میں مدراس میں طبع ہوا ہے۔

بیتال پچیسی اور **سنگھاسن بتیسی**۔ مشہور قصے ہیں اور کسی تفصیل کے محتاج نہیں ہیں۔ دہرم نراین لالو، سورت اور کئی ہندی مصنفوں نے ان قصوں کو لکھا ہے۔

محض یاد دہانی کے طور پر طوطا کہانی کا ذکر کرتا ہوں۔ اصل قصہ سنسکرت میں ہے۔ اس کے آٹھ مختلف نسخوں سے واقف ہوں اور اسی قدر ہندی اردو اور دکھنی میں ہیں۔ میں صرف نام گنوا دیتا ہوں۔ خاور شاہ، لعل و گوہر، جذب عشق جس کا میں نے خلاصہ ترجمہ کیا ہے۔ نیز مہر و ماہ اور ماہ منور جس کا متن میں نے شائع کیا ہے۔

شاعری

(از جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب - بی اے)

The poets eye in a fine frenzy rolling
Doth glance from Heaven to earth from earth to Heaven;
And as imagination bodies forth
The forms of things unknown, the poets pen
Turns them to shapes and gives to airy nothings
A local habitation and a name.

گوِی کی نفیس آنکھ وارفتہ سی گھومتی
نظر ڈالتی ہے زمین پر کبھی آسمان پر
توجوں جوں تخیل میں ڈہلتے ہیں انجانی
اشیاء کے پیکر۔ گوِی کا قلم اُن کی شکلیں
بنا کر مقرر بھی کرتا ہے ان خواب سی
ہستیوں کا مقام ایک بسنے بسانے
کو ایک نام۔

Shakespeare:
Midsummer Night's Dream.

انسان کی یوں بھی دو قسمیں ہو سکتی ہیں ایک وہ جو سخن گو ہیں دوسری وہ جو سخن فہم ہیں۔ نرے سخن گو کا ہی وجود ہوتا تو اس میں شک نہیں کہ وہ پرندوں کی طرح شعر الاپتا رہتا لیکن کوئی سننے اور سمجھنے والا نہ ہوتا تو بیچارہ شاعر اپنا سا مُنہ لے کر رہجاتا اور اس کے شعر پرندوں کے سریلے بولوں کی طرح ہوا کی نذر ہوجاتے، شاعر کے وجود کے ساتھ سخن فہم نوع کا ہونا لازمی ہے۔ لیکن اس کا عکس صحیح نہ ہوگا سخن فہم طبقہ کے موجود ہونے کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ شاعر پیدا کر سکے۔ شاعر اپنے وقت پر پیدا ہوتا ہے خواہ سخن فہم نوع اس کے استقبال کے لئے موجود ہو یا نہ ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نوع انسان

کی گوناگوں اقوام میں شاعر زیادہ قابل احترام سمجھا گیا ہے۔

جب کسی قوم میں وہ کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے جسے ترقی کہا جاتا ہے تو اس قوم کی ادبی دنیا یعنی سخن فہم طبقے میں ایک خاص گروہ پیدا ہونے اور ارتقا پانے لگتا ہے۔ اس گروہ کا پرانا نام سخن سنج اور جدید لقب نقاد ہے۔ اس گروہ کا پیشہ یہ ہوتا ہے کہ شعرا کے کلام کو سخن سنجی کی ترازو میں تولے اور تنقید کی کسوٹی پر کسے۔ اس گروہ سے اگر یہ سوال کیا جائے کہ تنقید کیا ہے؟ تو اس میں شک نہیں کہ اس گروہ کے سربرآوردہ اصحاب بہت کچھ اصول اور قوانین تنقید پر لکھ ماریں گے مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ آپ اور میں خاک نہ سمجھیں۔ ادبیات کی ارتقا کے ساتھ ساتھ یہ تنقید پیشہ گروہ اس قدر قلم اور زبان کے زور سے ادبی دنیا پر چھا جاتا ہے کہ شاعر بیچارے اس سے اتنے مرعوب ہو جاتے ہیں کہ اس کی تیوری کے ذرا سے بل پر جان سی نکل جاتی ہے اور اس کی جھوٹ موٹ کی مسکراہٹ سے جان میں جان آجاتی ہے۔ جس طرح ہندوستان میں بنیئے نے کسان بیچارے کو جونک بن کر اپنے قابو میں کر رکھا ہے، اسی طرح یہ سخن سنج گروہ شاعروں اور نثر نگاروں کو اپنے چنگل میں لے لیتا ہے۔

نقاد لوگ صرف یہ سمجھتے ہی نہیں بلکہ جوش میں آکر بعض اوقات لکھ بھی جاتے ہیں کہ شاعر ہونا آسان ہے لیکن سخن سنج ہونا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ یہ ایک پُرلطف دعویٰ ہے اور بعینہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک آیا یہ کہے کہ ماں بننا سہل ہے بچوں کا پالنا پوسنا بچوں کا کھیل نہیں۔ نقاد بیچارے کو آنا کا رتبہ بھی حاصل نہیں ہے اس لئے کہ اوّل تو شاعر طبعزاد دودھ پیتے ہی نہیں اور اگر عالم وجود میں آنے سے قبل اُن کی پرورش بطن شاعری میں کسی قسم کی ذہنی غذا سے ہوتی بھی ہے تو وہ اُن شعرا کے کلام سے ہوتی ہے جو اُس شاعر کے پیشرو یا ہم عصر ہوتے ہیں۔ یہ سب صحیح ہے لیکن پھر بھی نقاد کا وجود بالکل بے معنی اور بیکار نہیں۔ نقاد ایک طرح کا ترجمان ہوتا ہے اور شاعر کا خاص طور پر مطالعہ کر کے عامۃ الناس کو شاعر سے روشناس کراتا ہے۔ شاعر کے جواہر پاروں کو کھود کھود کر نکالتا اور دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ کام بھی اگر اس ہمہ گیر نظر اَن تھک محنت اور مذاق سلیم کے ساتھ کیا جائے جو سینت بیوے (Sainte Beuve) کی خصوصیات تھیں تو ظاہر ہے کہ ایسے کام سے عامۃ الناس

شاعر کے کلام سے زیادہ سبق اور مسرت حاصل کرسکتے ہیں۔ اُردو کی دنیائے ادب میں اس ناچیز راقم کا خیال ہے کہ ابھی تنقید کی صحیح ٹیک والے لوگ پیدا ہوئے ہیں اور خدا کرے جب ایسے لوگ پیدا ہوں تو وہ تنقید کی قوت کو اُردو ادب کی رکاوٹ میں نہیں بلکہ ترقی میں صرف کریں۔

شاعر ماں کے پیٹ سے شاعری کا عطیہ لاتا ہے اور اگر شاعر یہ نہ بیان کرسکے کہ شاعری کیا ہے ؟ تو اس کی شاعری میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں پیدا ہوسکتی۔ لیکن نقاد نقاد نہیں ہوسکتا جب تک اپنے دماغ میں اس کو واضح نہ کرلے کہ شاعری کیا شے ہے ؟ لیکن یہ سوال کچھ ایسا پرلطف ہے کہ اس پر صرف نقاد اصحاب نے ہی نہیں بلکہ خود شعرانے بھی بہت کچھ خیال دوڑایا اور بہت کچھ لکھ ڈالا، اس مسئلہ پر وہی مثل صادق آتی ہے جتنے منہ اتنی باتیں اور پھر شاعروں اور نقادوں کی باتیں ! اگر ان سب باتوں کو کوئی صاحب مؤلف مختلف زبانوں سے لے کر اکٹھا کردے تو بلا مبالغہ کسی قسم کے حواشی نوٹ مقدمہ دیباچہ اور تمہید کے یہ باتیں کئی جلدوں میں بھی نہ سما سکیں۔

بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کا قطعی جواب تو اسی وقت ہاتھ آئیگا جب یہ مسئلہ حل ہوجائے کہ "جان کیا ہے"؟ شاعری خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو کچھ ایسی چیز ہے کہ ہمارے سانس کے ساتھ ہے، انسان کا سانس انفرادی زلیست کے لئے جتنا ضروری ہے اتنا ہی سماجی زندگی کے لئے انمول ہے اس لئے کہ زبان سانس کا کھیل ہے بغیر زبان کے زندگی ممکن ہے گر وہ انسانی زندگی نہیں۔ زبان شاعری ہے۔ یعنی اگر شاعری نہ ہو تو زبان ممکن ہی نہیں۔ جن اصحاب نے لسانیت کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ زبان شاعری ہے اور ہر زبان کے الفاظ ابتداءً شاعرانہ تخیل کے کرشمے ہیں جن کو مانجھ مونجھ کر اور جن سے طرح طرح کے معنی وابستہ کرکے نامعلوم اور بے گنتی شعرا نے اس قابل کردیا ہے کہ آج اس زبان کے بولنے والے اُن الفاظ کو روزمرّہ زندگی اور ادبی ضرورتوں کے لئے بے تکلف لکھتے اور بولتے ہیں[1]۔

بہرپھر کر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعری کیا ہے ؟ اس پر راقم اپنا خیال آگے چل کر ظاہر کرے گا لیکن فی الحال اگر آپ اس بات کو مان لیں کہ شاعری کی جان تشبیہ ہے تو پھر اس کا مان لینا کہ شاعری کے بغیر

---

[1] ملاحظہ ہو باب دوم "زبان شاعری ہے" "Words and their ways in English speech" از گریناف اینڈ کٹ ریج (میکملن)۔

زبان کسر سے ممکن ہی نہیں کچھ زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ وحشی سے وحشی لوگوں کی بول چال میں بھی تشبیہ کا ہونا اسی طرح لازمی ہے جس طرح عشق و محبت کا ان وحشی دلوں میں گھر کرنا ناگذیر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وحشی قبائل میں میر اور غالب کی سی منجھی منجھائی جچی تلی تشبیہ اور نور جہاں اور جہانگیر کی سی الفت کا لطیف اور شائستہ افسانہ نہ ہو۔

لیکن پھر سوال وہ کا وہی رہا کہ شاعری کیا ہے؟ ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اس کا جواب اور ایسا جواب جس پر سب آمنّا صدّقنا کہہ اٹھیں کوئی نہیں۔ البتہ شاعری کے متعلق میرا جو اپنا خیال ہے، اسی قارئین کرام کے سامنے پیش کرنا ہے۔ یہ بہت آسان تھا کہ بڑے بڑے لوگوں نے ارسطو سے لے کر لفکاڈیو ہرن (Lafcadio Hearn) تک اور ابن رشیق سے لے کر مولانا حالی تک شاعری کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس کو نہایت اطمینان اور مزے کے ساتھ دہرا دیا جائے، اس طرح ایک طرف تو مضمون پھیلتا جاتا اور دوسری طرف یہ سہولت ہوتی کہ میری انگلیاں تو دکھتیں لیکن دماغ آرام میں رہتا اس لئے کہ میں دوسروں کا سوچا لکھتا جاتا۔ مگر میں نہ اپنی انگلیاں زیادہ دکھانی چاہتا ہوں نہ دماغ۔ میں شاعری کی بے گنتی تعریفوں میں سے صرف ایک کو یہاں دُہراؤں گا یہ تعریف مسٹر اے سی براڈلی (A. C. Bradley) نے اختیار کی ہے اور وہ آکسفورڈ کی جامعہ میں شاعری کے پروفیسر ہیں۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ تعریف پروفیسر صاحب کی طبع زاد ہے۔ پروفیسر بہت کم طبع زاد باتیں لکھتے ہیں۔ ان کا مطالعہ اس قدر وسیع ہوتا ہے کہ اُن کے قلم یا زبان سے جو کچھ جان بوجھ کر یا انجانی سے نکل پڑتا ہے اس کا حوالہ کسی نہ کسی کتاب میں ضرور ہوتا ہے وسیع مطالعہ والے حضرات کچھ ہیٹے سے ہو جاتے ہیں اور اسی کو بڑا تیر مارنا سمجھتے ہیں کہ جو جواہر پارے ادب میں موجود ہیں اُن ہی کو الٹ پھیر کر بیان کر جائیں۔ بہرحال یہ تعریف اگر الفاظ کا خیال نہ کیا جائے تو پروفیسر صاحب کی نہیں بلکہ شکسپیر کی ہے یہ ممکن ہے کہ شکسپیر نے بھی کہیں سے اڑا لی ہو۔ جس طرح وہ اپنے کھیلوں کے ڈھانچ (پلاٹ) بے تکلف اوروں سے لے لیا کرتا تھا۔ مگر اس کی تحقیق اول تو مشکل اور دوسرے بے ضرورت البتہ شکسپیر کے متعلق اتنا خیال رہے کہ وہ نہ تو وسیع مطالعہ کا انسان تھا۔ یونہی سی لاطینی اور برائے نام یونانی جانتا تھا، اور نہ اس کے زمانہ میں برساتی کیڑوں کی طرح کتابیں تھیں اور

نہ لکھنے والے۔

خیر اب شاعری کی اس تعریف کو ملاحظہ فرمائیے۔ شکسپیر کے سندر الفاظ کا بھونڈا ترجمہ اس مضمون کی پیشانی پر دیدیا گیا ہے۔ مسٹر براڈلی کے الفاظ کا ترجمہ یہ ہے:۔

"شاعری تخیلی پیکروں کا پیدا کرنا ہے" "Poetry is the creation of imagery."

اتنی دیر تک اس تعریف کا انتظار قارئین کرام نے جن امیدوں کے ساتھ کیا ہوگا اس کے بعد یہ تعریف مجہول بالمجہول سے ضرور مایوسی ہونی چاہئے۔ مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے۔ انسان کی تعریفات مجہول ہی ہی ہوا کرتی ہیں یہ عجیب لطیفہ ہے کہ جو چیزیں سمجھنے کے قابل ہیں اور اس عالم پر اسرار کی پہیلیاں بوجھنی بہت ضروری ہیں وہیں انسان کی منطق جواب دے دیتی ہے وہیں انسان الجھی الجھی سی باتیں بنانے لگتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کا نفس بھی کولھو کا بیل ہے آنکھوں پر اندھیری پڑی ہوئی ہے اور ایک دائرہ میں چکر کھاتا رہتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے چکر کھانے کو اندھیری کی وجہ سے آگے بڑھنا تصوّر کرلے۔

غرض اس شاعری کی تعریف کو پڑھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تخیل کیا ہے؟ اس سوال کے جواب دینے کے یہ معنی ہوں گے کہ قارئین کرام کو نفسیات کی بھول بھلیاں میں ڈال دیا جائے اور پھر اگر آپ کہیں یہ پوچھ بیٹھیں کہ نفس کیا ہے تو پھر اس مضمون کا خدا ہی حافظ ہے۔ نفس کے سمجھانے کو ضخیم جلدیں درکار ہیں اور پھر بھی یہ ناچیز تو کوئی چیز نہیں۔ بڑے بڑے دماغ بھی نہیں سمجھا سکتے تو اب یہ مضمون اسی طرح آگے چل سکتا ہے کہ آپ تخیل اور نفس کی تعریف اور توضیح کے طالب نہ ہوں۔

تخیلی پیکروں کا پیدا کرنا شاعری ہے۔ پیدا ہونے کی بہترین مثال افزائش نسل ہے۔ نر اور ناری دونوں جانب سے مادی اور نفسی عنصر میل کھاتے ہیں اور اس میل کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ ایک تیسری شئے ہوتی ہے یعنی یہ کہنا بجا ہے کہ بچے میں ماں باپ دونوں کا حصّہ ہے دونوں کے حصّے کیا بلحاظ مادّہ اور کیا بلحاظ نفس مل جل کر ایک نئی چیز بن جاتے ہیں بچہ ایک جداگانہ مستقل ہستی ہوتا ہے۔ یہ تصور ہے پیدائش کا اب ادبیات کے میدان میں اس تصور کو نظر کے سامنے رکھ کر خیال دوڑائیے کہ یہاں پیدا کرنے کا کیا مفہوم

ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو ظاہر ہے کہ ادب میں جو چیزیں پیدا کی جا سکتی ہیں وہ گوشت پوست سے مستغنی ہوتی ہیں۔ ایک مثال لے لیجئے۔ مولانا نذیر احمد نے اصغری' کو ادبی ہستی دی ہے۔ اصغری ایک ایسی ہستی ہے جس نے گوشت پوست میں کبھی جنم نہیں لیا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نے جو اصغری پیدا کی ہے وہ اُس طرح نہیں پیدا کی جس طرح اُن کی اولاد پیدا ہوئی یعنی مولانا کے دماغ نے بغیر کسی بیوی کے اصغری کو پیدا کیا۔ اب آپ کے یہ ذہن نشین ہو گیا ہوگا کہ افزائش نسل کے لئے نر اور ناری کا یکجا ہونا اٹل ہے۔ ادبی ہستیوں کے لئے اس قسم کی یکجائی ضروری نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ مولانا کی اصغری محض ایک تخیلی پیکر ہے۔ لیکن اس تخیلی پیکر کی خوبی یہی ہے کہ اس میں گوشت پوست کے سوا اور ساری باتیں ویسی ہی ہوں جو جیتے جاگتے سانس لیتے انسانوں میں ہوتی ہیں۔ اصغری کا احوال ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی واقعی ایک شریف بیوی کی سوانح عمری ہے جو کسی زمانہ میں گزر چکی ہے اس مادی دنیا میں سانس لے چکی ہے۔ اُس کی بات چیت اس کی چال ڈھال اس کے طور طریقے اس طرح بیان کئے گئے ہیں، اُن میں اس طرح جان پھونکی گئی ہے کہ اُن کو پڑھ کر ہمارے تخیل کے پردے پر ایک تصویر کھنچ جاتی ہو اور تصویر بھی ایسی ہستی کی گویا ہم نے کبھی اس کو اپنی آنکھوں دیکھا ہے۔

اگر آپ اس تفہیم سے اکتا نہ گئے ہوں تو میری خاطر اس پہلو سے بھی غور فرمائیے کہ ہم اپنے ہم جنسوں کو دورانِ زندگی میں دیکھتے بھالتے ہیں۔ اُن میں اپنے گھر والے رشتہ ناتے والے دوست احباب ملنے جلنے والے بھی ہوتے ہیں جن سے ہمیں زیادہ ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے اور ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن سے سرسری شناسائی یا عارضی روشناسی ہو جاتی ہے یہ جتنی صورتیں ہم دیکھتے ہیں۔ اُن میں سے بعض واضح اور گہری۔ بعض موہوم اور سطحی ہمارے تخیل کے صفحات پر مرتسم ہو جاتی ہیں موہوم سی صورتیں اگرچہ وہ گوشت پوست والے چلتے پھرتے انسانوں کی سی کیوں نہ ہوں، بسا اوقات ہمارے تخیل کے صفحہ پر سے اڑ جاتی ہیں۔ اب اس قوت کو ملاحظہ کیجئے کہ کسی شخص کا سرے سے گوشت پوست والا وجود ہی نہیں مگر ایک خلاق دماغ اپنے تخیل کے جادو سے اس کی تصویر کھینچتا ہے اور اصغری بالکل ایسی معلوم دیتی ہے کہ گویا کسی اپنے رشتہ کی دیکھی بھالی ہوئی کا نقشہ سامنے

رکھا ہے۔

اس بیان سے تخیل کی دو صورتیں ظاہر ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ آپ نے ایک اصلی انسان کو دیکھا اور اس طرح کافی غور سے دیکھا کہ جب اس کی صورت بھی سامنے نہ ہو وہ موجود بھی نہ ہو تو اس وقت بھی آپ کا تخیل دماغ میں اس کی صورت پیش کر سکتا ہے تخیل کی دوسری قوت یہ ہے کہ مولانا نذیر احمد نے ایک فرضی عورت کو تخیلی پیکر دیا اور اس طرح دیا کہ ان کے الفاظ نے آپ کے تخیل کے پردہ پر بھی بن گوشت پوست والی ہستی کے باوجود بھی ایک ایسی تصویر کھینچ دی جیسی اپنے کسی خاص عزیز قریب یا مخلص دوست کی جس سے آپ بے تکلف ملتے جلتے ہوں جس کے دل کی باتیں آپ پر روشن ہوں جس کے رجحان اور جذبات سے آپ بخوبی واقف ہوں اور آپ کے دماغ پر سے یہ تصویر ایک دفعہ کھینچنے کے بعد پھر کبھی محو نہیں ہو سکتی۔

اُردو ادبیات کے میدان نظم میں ایسا کیرکٹر جو اصغری کی طرح جیتا جاگتا ہو مجھے نہیں ملا۔ اُردو میں ڈراما (ناٹک) کے رواج نہ پانے سے نظم میں کسی شخص کے خیالی پیکر کے پیدا کرنے کا ایک زبردست شعبہ گویا مفقود ہی رہا۔ دوسرے یہ ستم ہوا کہ ہمارے شعرا کو پریشاں گوئی اور ریزہ خیالی کی کچھ ایسی لگت سی پڑ گئی کہ مسلسل نظم کا لکھنا نہ صرف دوبھر ہی ہو گیا بلکہ مانے ہوئے اُستادانِ فن کے بھی قابو کی بات نہ رہی۔ یہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ شاعری کی جان تخیلی پیکروں کا پیدا کرنا ہے اور اسی لئے ہر شاعر میں جو در اصل شاعر ہو خواہ وہ ردیف و قوافی کی زنجیروں میں بندھا ہو۔ بھانت بھانت کی پردیسی بحروں میں جکڑا ہو خواہ غزل کے خواب پریشاں میں مبتلا ہو اور غیر مسلسل تک بندی کی بھول بھلیاں میں قید ہو تخیلی پیکر پیدا کر ہی لیتا ہے۔ اس قسم کے تخیلی پیکر مصوّر کی تصویر کے مماثل ہوتے ہیں اُن میں پوری طرح جان نہیں پڑتی۔ اس کی بہترین مثال ناچیز راقم کی رائے میں میر حسن والی ذیل کی تصویر ہے میر حسن واقعی شاعر تھے اور ان کی اس تصویر میں نری ایک چوکھٹے والی بے جان سی تصویر ہی نہیں پائینگے بلکہ اس میں چلت پھرت آپ کو ملے گی اور اس طرح ایک حد تک کچھ جان سی پڑی ہوئی نظر آئیگی اُردو کے مشہور و معروف سراپا بھی اس تصویر کے سامنے بے جان سے ہیں ان تمام سراپاؤں کے

پڑھنے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواب میں موہوم سی دیکھی ہوئی صورت کا خاکا کھینچا جا رہا ہے۔ لیکن مٹا مٹا بھیانک سا جیسے ہمارے بعض اُردو اخباروں میں تصاویر دی جاتی ہیں۔ بہر حال میر حسن نے بینظیر اور بدر منیر کا آمنا سامنا کرا دیا ہے اور

"گرے دونوں آپس میں ہو کر اسیر"

"ستارہ سی وہ دلربا" نجم النسا گلاب چھڑکتی ہے دونوں ہوش میں آتے ہیں۔ شہزادہ تو

وہیں رہ گیا نقش پا سا بچک۔

لیکن بدر منیر وہاں سے لجا کر اٹھلاتی ہوئی بارہ دری کی طرف بھاگتی ہے۔ اور میر حسن فرماتے ہیں۔

کہ وہ نازنیں بھی جھجک مُنہ چھپا — کمر اور چوٹی کا عالم دکھا
چلی اس کے آگے سے منہ موڑ کر — ....

وہ گُدّی وہ شانے وہ پشت و کمر — وہ چوٹی کا کولے پہ آنا نظر

.... — ....

وہ کنگھی وہ چوٹی کھچی صاف صاف — کناری کا پیچھے چمکتا موباف
کہوں اس کی چوٹی کا کیا رنگ ڈھنگ — کہ جوں آخری شب ہو جھمکے کا رنگ
نمایاں ہو یوں اوڑھنی سے جھلک — کہ جو ابر میں برق کی ہو چمک

.... — ....

وہ پیٹھ اس کی شفاف آئینہ ساں — تس اوپر وہ چوٹی کا پڑنا وہاں
.... — کہ جوں ہوئے دریا پہ کالی گھٹا

جن الفاظ سے تصویر کھینچی ہے وہ یہ ہیں۔

"کمر اور چوٹی کا عالم دکھا"

اور اس مصرع کی بھی جان "عالم" ہے۔ "وہ چوٹی کا کولے پہ آنا نظر" یہ تصویر کو اور واضح کرتا ہے اور "کناری کا پیچھے چمکتا موباف" تصویر کو روشن کرتا ہے، اوڑھنی میں سے جھلک اور برق کی ابر

میں سے چمکنے کی تشبیہ نے تصویر کو مکمل کر دیا اور اس میں سرعت پیدا کر دی۔ بدر منیر کے دور نکل جانے پر پیٹھ کی شفاف سطح پر چوٹی کا لہرانا سمندر پر دو کالے بادلوں کی ایک "پٹی" کا ہچکولے کھانا ایک دل فریب تشبیہ ہے اور اس سے یہ تصویر دلکش ہو جاتی ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ تخیلی پیکر کسی انسان کا کیرکٹر یا انسان کی مصوروالی تصویر ہی ہو، صبح شام کے سورج کی روشنی کے رنگ برنگی توس قزحی نظارے، پہاڑوں کے اُتار چڑھاؤ، ابھار اور ڈھلاؤ سمندر کا سانس لینا، سیہ موجوں کا پہاڑوں کی طرح اُبھرنا، بادلوں کی طرح پھیلنا، ندیوں کا سانپ کی طرح لہرانا، جھیلوں کا آنکھیں پھاڑ کے ستاروں کا تکنا، زمین کا نشیب و فراز درختوں کے جھنڈ، گھانس کا لہلہانا، موسموں کی بہاریں، غرض فطرت کا ہر منظر سہاونا یا ڈراونا، سماج کا مدو جزر، انسانی تعلقات کی پیچیدگیاں، اقتصادی بلندیاں اور پستیاں، سیاسی سکون اور تلاطم، صداقت پر قربانیاں، گندم نما جوفروشیاں، نفس کی کیفیتیں، جذبات کا جوار بھاٹا، خواہشات نفسانی کا حیرتناک کھیل، غرض فطرت انسانی کا انفرادی اور اجتماعی ہر رنگ شاعر کی مصوّری کے لئے ایک زبردست موضوع ہے۔ فطرت کے بےگنتی روپ انسان اور سماج کے بےشمار سوانگ ان سب کی تصویر کھچ سکتی ہے، ان کو تخیلی پیکر دیا جا سکتا ہے۔

پانی سورج کی تمازت سے بخار بن جاتا ہے اور قدرت کا یہ عمل ہر جگہ جاری ہے، سمندر کے سینہ پر، زمین کے مسامات میں، درختوں کے پتّوں پر، جنگل کی جھیلوں اور ندیوں میں۔ ہر جگہ پانی صورت بدلتا رہتا ہے اور پھر کرہ ہوا کے بلند اور سرد طبقوں میں، بادل کے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ایک قدرت کا روزانہ کرشمہ ہے، شیلی (Shelly) نے 'بادل' کے نام سے ایک لِرِک نظم لکھی۔ یہ نظم لطافت، سریلے پن اور تخیلی پیکروں کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کے آخری بند کے پہلے چار مصرعوں کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔ ایک اعلیٰ شاعر کے اعلیٰ پایہ کے کلام کا ترجمہ دوسری زبان میں ایک کٹھن کام ہے۔ یہ ترجمہ محض اس موقع کے لئے نذر ناظرین ہے۔ اتنا واضح رہے کہ اس نظم میں 'بادل' زبان حال سے گویا ہے۔

ہاں ہاں میں ہوں لاڈلا بیٹا سُندر پرتھی اور پانی کا I am daughter of Earth and Water

امبر نے ہی گود میں پالا And the nursling of the sky

میں گذرتا ہوں مساموں میں سے ساحل کے اور سمندر کے I pass through the pours of the Ocean and shores

روپ بدلتا پر نہیں مرتا I change but I cannot die.

میں جب ان مصرعوں کو پڑھتا ہوں ۔ شے لی کے مصرعوں نہ کہ اس ناکافی ترجمہ کو ۔ تو میرے تخیل کی سیر بین کے سامنے ایک دھواں دھار منظر کھل پڑتا ہے ۔ بھاپ کا ہر طرف سے کسی کے کھلے بالوں کی طرح لہرا لہرا کے اُٹھنا ، ہوا کی اونچائیوں میں بادل بن کر پھولنا اور پھلنا ۔ طرح طرح کی شکلیں بنا نا ہاتھیوں کی طرح جھومنا ، روئی کے گالوں کی طرح پھٹنا اور ہوا میں بہنا ، کہیں سورج کی کرنوں سے جگر جگر کرنا ، کسی طرف رات کی سی سیاہی لے کر ڈراونا سا بننا اور پھر مینہ کی دھاریں اور دہی پانی کا پانی ۔ یہ ہے تخیلی پیکر جو میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ آخر کا مصرع جس کا ترجمہ میں نے یہ کیا ہے ۔ " روپ بدلتا پر نہیں مرتا " میری اس سب سے گہری خواہش کو کہ میں غیر فانی ہوں ، عجیب موہوم اور لطیف پیرایہ سے ایک ٹہوکا سا دے دیتا ہے ۔

اُردو شاعری میں ایسے مسلسل اشعار جو تصویر کی تصویر ہوں اور حیات انسانی کا تجربہ بھی ہوں ، تلاش کرنے سے ضرور مل جاتے ہیں ۔ لیکن شاعری کے عام رنگ کا زہریلا اثر اس قدر سرایت کر گیا ہے کہ جو شعرا طبعاً اس رنگ کی نظمیں لکھ سکتے تھے ان کو بھی غزل گوئی اور حیات اصلی سے آنکھیں بند کر لینے سے پیشتر محض قافیہ پیما بنا دیا ، جہاں تک اردو شاعری پر نظر دوڑائی جاتی ہے ، تو ایسی نظمیں یا اشعار جن میں تخیلی پیکر کے ساتھ ساتھ اصلیت بھی ہو بڑی مشکل سے ہاتھ آتے ہیں ۔ نظیر اکبرآبادی البتہ ایک ایسا شاعر ہے جس کے کلام میں اس قسم کی نظمیں اور اشعار نسبتاً بہت زیادہ ملتے ہیں مگر یہی وہ شاعر ہے جس کو ہمارے سخنوروں اور سخن سنجوں نے نام دھر دھر کے اس قدر نکو بنا دیا کہ دنیائے اُردو کی مہذب محفلوں سے تقریباً نظیر کے کلام کو خارج کر دیا گیا ہے ۔ لیکن نظیر کو عام حلقہ نے سر آنکھوں پر لیا اور اس کی نظمیں فقیروں کی زبان سے ہندوستان

کے دور دور گوشوں میں محلوں کی ڈیوڑھیوں غریبوں کی جھونپڑیوں بازاروں اور گلیوں میں گونجتی رہیں - یہ تاثیر کے جادو سے بھرا ہوا مصرع کس نے نہیں سنا۔

"سب ٹاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا"

یہ اردو کی انمٹ چیزوں میں سے ہے اور تخیلی پیکر اس قدر جیتا جاگتا اور الفاظ ایسے موزوں اور برجستہ ہیں کہ اردو میں یہ مصرع ایک ضرب المثل سی ہو گیا ہے اور ایک دفعہ کان میں پڑنے کے بعد ممکن نہیں کہ پھر حافظہ سے نکل جائے ۔ اس نظم کا ایک بند یہ ہے ۔

زر دام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے — ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈانڈا ہے
پھر ہانڈا ہے نا بھانڈا ہے نا حلوا ہے نا مانڈا ہے — جب نائک تن کا نکل گیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے
سب ٹاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

اب ریل نے وہ پرانے بنجارے کے ٹاٹھ بھی پڑے رہنے دئے اور اس لئے قارئین کرام کو بغیر خاص مطالعہ اور تخیل پر زور دئے اس بند کا تخیلی پیکر مستحضر نہ ہو سکے گا لیکن شمالی ہند کے جاڑے کی تصویر دیکھئے ۔

اور ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی — جب ماہ اگھن کا ڈھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
پالا بھی برف پگھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی — دن جلدی جلدی چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی
چلّا خم ٹھونک اچھلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو بجتی ہو سب کی بتّیسی — دل ٹھوکر مار پچھاڑا ہو اور دل سے ہوتی ہو کشتی سی
گلے پر کلّا لگ لگ کر چلتی ہو منہ میں چکی سی — ہو شور پھو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی کی
ہر دانت چنے سے دلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

جو ہر دم کپ کپ ہوتی ہو ہر آن کڑا کڑ اور تھر تھر — ہر ایک مکاں میں سردی نے آ باندھ دیا ہو یہ چکّر

بیٹھی ہو سردی رگ رگ میں اور برف پگھلتا ہو پتھر جھڑ باندھ مہاوٹ پڑتی ہو اور تس پر لہریں لیکر
سناٹا باؤ کا چلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

اس تصویر کی توضیح کی ضرورت نہیں۔ تصویر صاف اور چلتی پھرتی ہے۔ البتہ "ہنس ہنس پوس سنبھلتا ہو" اور "دن جلدی جلدی چلتا ہو" کس قدر جان ڈالنے والے اور روشن رنگ بھرنے والے اور اہلیت میں ڈوبے الفاظ ہیں۔

ہر اچھے اور اعلیٰ ترین کلام میں تخیلی پیکر کا ہونا لازمی ہے۔ خواہ وہ کلام ایک مصرع یا بیت کی صورت میں ہو خواہ ایک مستقل نظم ہو جس میں بہت سے مصرعے اور طرح طرح کی ترکیبوں سے بند بنائے گئے ہوں۔ اردو شاعری میں ایسی ابیات بہت کم ملیں گی جن میں تخیلی پیکر مخفی ہو یہ ننھی منی تصویریں سی ہوتی ہیں جن کو کلام میں سے دیکھنے پر مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔

میر کے اس شعر کو لیجئے ؎

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا! اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

اس شعر کی ذہنی بندی سے جو نقشہ میری آنکھوں کے سامنے بندھ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک پلنگ پر ایک شخص دراز ہے سوکھ کر کانٹا چہرہ پر زردی کھنڈی ہوئی البتہ منہ کی راہ سے دم نکلا ہے اور مردنی چھاگئی ہے۔ ایک سن رسیدہ آدمی جو اس بدنصیب مرنے والے کا کوئی بڑا بوڑھا ہے پلنگ کی پٹی کے پاس کھڑا ہو کر جھک کر اسے دیکھتا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ وہ بدنصیب ہو چکا اپنی ران پر ہاتھ مار کر بول اٹھتا ہے:-

دیکھا! اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

اس شعر میں "دیکھا" کا لفظ وہ بجلی کا بٹن ہے جس کو دباتے ہی اس شعر والا "تخیلی پیکر" دماغ میں تصویر کی طرح سامنے آجاتا ہے۔

غالب کا شعر ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

یہ ایک نفسیاتی واقعہ ہے کہ جب انسان اپنی آرزؤں کے پورا کرنے میں ناکامیاب ہوتا ہے تو اپنے ماحول سے اس کا دل اکھڑ سا جاتا ہے، متواتر ناکامیوں سے اس کا جی ہٹیا ہو جاتا ہے اور جس شخص سے خواہ وہ جان پہچان کا ہو یا شناسا نہ ہو دوست ہو یا اجنبی وہ ملتا ہے اُسے یہی خیال ہوتا ہے کہ سب میری ناکامیوں پر دل میں ہنستے ہیں اور میری غیبت میں میرا تمسخر اڑاتے ہیں۔ غرض اس کے دل میں یہ ٹھن جاتی ہے کہ کسی طرح اصلیت سے بھاگ جاؤں۔ اصلیت سے بھاگنا کئی طرح ہو سکتا ہے۔ خودکشی کر لی جائے اپنے مقامی ماحول کو بدل دیا جائے اور کسی اور جگہہ سکونت اختیار کر لی جائے یا یہ کہ اپنے حواس کو نشہ کی ترنگوں میں ڈبو دیا جائے اور اس طرح اصلیت کو فراموش کیا جائے اب غالب کا اوپر والا شعر پڑھئے۔ ایک شخص ہیبت زدہ حال نہ کپڑوں کا ہوش نہ تن کی خبر زیست سے اکتایا ہوا آنکھیں پھٹی پھٹی جن میں لذت حیات کی چمک کے بجائے وحشت اور دیوانہ پن کی سی جھلک ہو پہلو بدلتا بے چین سا بیٹھا ہوا ہے۔ ایک دوست ایک نصیحت کرتا ہے کہ شراب نہ پینی چاہیئے اور جیسی نصیحت کرنے والوں کی عادت ہوتی ہے ایک لمبا چوڑا وعظ کرتا ہے اور عامیانہ استدلال پیش کرتا ہے کہ لہو ولعب اور عیش رانی کو خدا اور رسول نے منع فرمایا ہے وغیرہ وغیرہ جس شخص کو اس طرح نصیحت کی جا رہی ہے وہ کوئی عامیانہ شخص نہیں ہے۔ اس کی نظر نفس کی گہرائیوں پر پڑتی ہے۔ اکتا دینے والے اور وہ بھی مولویانہ وضع کے ناصح کی بڑ کو سنتے سنتے آخر بے تاب ہو کر وہ بیچارا چیخ اُٹھتا ہے کہ میں اُسے تعلیم کرتا ہوں کہ مے نوشی بُری چیز ہے روسیاہی کا باعث ہے۔ لیکن میری مے نوشی لہب ولعب کے خیال سے نہیں ہے۔ میں اس دنیا کے آلام و مصائب ناانصافیوں اور ناکامیوں یا ایک لفظ میں اس دردناک اصلیت سے بیزار ہوں میں اس سے بھاگنا چاہتا ہوں۔ اور اس کی یہ صورت ہے کہ شراب پی کر اس اصلیت اور اپنے آپ کو

بھلا دینا چاہتا ہوں اور یہ ایسے وقت ہو سکتا ہے کہ مجھ پر دن رات نشہ کا اتنا کیف ضرور رہے کہ اصلیت سے اور خود سے بے خبر سا رہوں۔ میں معمولی شرابیوں کی طرح بدمست اور مدہوش نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہتا ہوں۔

اب زیادہ مثالوں کی نہ تو ضرورت اور نہ اس مضمون میں گنجائش۔ قارئین کرام ہر شاعر کے مطالعہ کے دوران میں ایسی مثالیں پاتے جائیں گے۔ اتنا البتہ ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر شعر والا تخیلی پیکر ہر شخص کے لئے من وعن یکساں نہیں ہو سکتا اوپر کی مثالوں میں جو تخیلی پیکر پیش کئے گئے ہیں وہ وہ ہیں جو اس ناچیز راقم کے تخیل کے پردے پر ان اشعار کے مطالعہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ بڑی چیز یہ ہے کہ شعر سے تخیلی پیکر پیدا ہو۔ ہر مطالعہ کرنے والے کے تخیل پر جو تصویر کھنچے گی وہ جداگانہ ہوگی اور ہونی چاہیئے۔

شاعر کے پاس وہ جادو کی چھڑی جس کے چھوتے ہی "کچھ نہیں" سے تصویروں کا مرقع نکل پڑتا ہے تشبیہ ہے۔ شاعر کے ذہن میں جہاں پھڑکتی ہوئی تشبیہ آئی اور تخیلی پیکر ڈھلنے لگے۔ تیر بہدف تشبیہ کا انتخاب شاعر کی نظر پر منحصر ہے۔ کوئی نہیں سکھا سکتا کہ شاعر کس طرح موزوں تشبیہ تلاش کرے اور چُنے۔ یہ نظر ماں کے پیٹ سے ملتی ہے۔ "تشبیہ" کے ذہن میں ابھر آنے کے بعد دوسرا مرحلہ شاعر کا یہ ہوتا ہے کہ اس ذہنی تشبیہ کو جو جگنو کی طرح ذہن میں کبھی موہوم کبھی واضح پھرتی رہتی ہے ایسے الفاظ کا جامہ پہنایا جائے کہ پڑھنے والوں کے تخیل میں جو تخیلی پیکر پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے اُس کو چھیڑے جگائے اور اس طرح شاعر اپنے تخیل کی قوت یعنی تشبیہ الفاظ کی مناسبت سے پڑھنے والے کو مجبور کر دے کہ اس کے تخیل کے پردہ پر بھی ویسا ہی تخیلی پیکر پیدا ہو جائے۔ اعلیٰ شاعر کے کلام کا مطالعہ اسی وجہ سے انمول شے ہے کہ ایسے شاعر کے تخیل کے جادو سے ہمارے تخیل کی پیدا کرنے والی قوت جاگ اٹھتی ہے اور اس دنیا میں پیدا کرنے والی قوت سے کام لینے میں۔ خواہ اس قوت کی جولان گاہ مسہری ہو خواہ ادبیات موجد کی تجربہ گاہ ہو یا مصنوعات کا کارخانہ (ورک شاپ) جو مسرت اور لذت حاصل ہوتی ہے اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی لذت نہیں۔

اب اگر آپ نے شاعری کی اس تعریف کو سمجھ لیا ہے تو گویا اس مضمون کی پہلی قسط کا جو منشا تھا وہ پورا

ہوگیا۔ مجھے اس سے قطعاً بحث نہیں کہ آپ اس تعریف کو تسلیم بھی کریں۔ دوسری قسط میں اس تعریف کی روشنی میں اُردو شاعری پر نظر ڈالنی مقصود ہے اور صرف اتنی استدعا ہے کہ دوسری قسط کے پڑھنے کے دوران میں آپ اس کا خیال نہ فرمائیں کہ جو کچھ اردو شاعری کے متعلق لکھا جائے گا وہ کہاں تک آپ کی شاعری والی تصویر کے مطابق ہے بلکہ آپ کی اس پر نظر رہے کہ جو تعریف شاعری کی اس تحریر میں پیش کی گئی ہے اس کے مدنظر اس ناچیز راقم کے خیالات اُردو شاعری کے بارے میں درست ہیں یا نہیں رہا یہ امر کہ وہ خیالات آپ کے نقطہ نظر سے مغالطہ انگیز ہیں یا مغالطہ سے پاک ہیں ایک بے تعلق سی بات ہے اور مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں۔

حامداً و مصلیاً

میلادِ نبوی صلعم

(از نتیجۂ فکر جناب سیّد ہاشمی صاحب)

کہیں کہیں نکل آئے ہیں پھول کانٹوں پر
کہ جھاڑیاں ہوئیں گلشن کے نام سے آباد ....
کیا کسی نے نہ خاشاک و خار کو پھر یاد
نفوسِ چند کا اے اہلِ ارض صدقہ ہے   کہ سجدہ گاہ ملائک ہے خاکِ آدم زاد

جھکے ہوئے ہیں ستارے کہ آج کِس کے طفیل
ہوئی ہے عرش سے اونچی زمین سفلہ نژاد
علیہ صلِّ وَ سَلِّم و آلہ الامجاد!

مقدمۂ دیوان درد

(از جناب مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی۔ المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر)

کوئی درد آشنا کہہ گیا ہے ؎

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار　　　زیک ساغر دریں بزم اند سرمست
ولے۔ با بادہ بعض حریفاں　　　فریب چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم　　　ورائے شاعری چیزے دگر ہست

خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے دم قدم سے "ورائے شاعری" مضامین سے اُردو ادب فیضیاب ہوا۔[1]

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا　　　ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں!

عموماً اُردو شاعری کا سرمایۂ ناز حُسنِ ظاہر کے انداز ہیں جن میں حُسنِ بیان نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ خواجہ صاحب کی چشم حق بیں جمال حقیقی کے جلووں سے منور تھی۔ وہی نور ان کے کلام میں تاباں ہے۔ میر تقی میر لکھتے ہیں "گلچین خیالِ اور گلِ معنی دامن دامن" یہی وجہ ہے کہ خواجہ صاحب کے کلام کا پایہ عام شاعری سے بالاتر ہے۔

ادبِ اُردو سید راس مسعود صاحب کے خاندان کی سرپرستی کا برسوں سے منت پزیر ہے۔ سرسید نے اُردو نثر کو "بیان مطالب" کی قوت بخشی۔ نکتہ شناس "پوتے" نے نظم اُردو کی خدمت کی۔ "انتخاب زرین" کی اشاعت سے اُردو نظم کا نام روشن کیا۔ سونے میں سہاگا ڈالا۔ اساتذۂ اُردو کے دواوین خوبی و خوش اسلوبی سے شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ اوسی سلسلے کی ایک کڑی "دیوان درد" بھی ہے۔ شروانی دہقانی مقدمہ نگاری پر مامور ہو۔ عین سعادت کہ خواجہ صاحب کی بزمِ ادب میں باریابی کا ذریعہ ہاتھ آیا۔ ع

آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

---

[1] دیوان مطبع نظامی بدایوں میں زیر طبع ہے۔

خواجہ صاحب کے حالات

نام خواجہ میر۔ دردؔ[1] تخلص صحیح النسب حسینی سید ہیں۔ آبائی سلسلہ بارھویں پشت میں خواجہ بزرگ بہاؤ الدین نقشبندی قدس سرّہ سے اور چھبیسویں پشت میں حضرت امام عسکری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ مادری سلسلہ نسب حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔
خواجہ صاحب کے والد کی والدہ بھی حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھیں۔ والد کا نام خواجہ ناصر۔ عندلیب تخلص نانا میر سید محمد حسینی تھے جو بیٹے تھے نواب میر احمد خاں شہید کے۔ نواب صاحب پانی پت کے معرکے میں نادر شاہ کے مقابل میں شہید ہوئے۔ جہانکشائے نادری میں اُنکا ذکر ہے۔ میرزا رفیع سوداؔ کے ممدوح تھے۔ خواجہ صاحب کے نسب کے بیان میں تذکرہ نویسوں نے فاحش غلطیاں کی ہیں۔ ہمارا بیان خواجہ صاحب کے علم الکتاب سے ماخوذ ہے۔ مسکن پُرانی دلّی میں تھا۔ اُسی محلہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کی بھی سکونت تھی۔ "اُجڑے دیار" کی آبادی و مردم خیزی۔ اللہ اکبر!

خواجہ ناصر صاحب کے والد بخارا سے تحصیل علم کے بعد عہدِ عالمگیری میں وارد ہندوستان ہوئے تھے۔
خواجہ محمد ناصر صاحب ہندستان میں پیدا ہوئے۔ ابتداءً شاہی منصبداروں میں شامل تھے آخر منصب ترک کرکے یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ حضرت قبلۂ عالم خواجہ محمد زبیر سے بیعت تھے۔ حضرت شاہ گلشن بیر صحبت میں شاہ گلشن کی نسبت خواجہ صاحب ایک موقع پر فرماتے ہیں کہ "اُنکے فارسی کلیات میں دو لاکھ کے قریب شعر تھے"

---

[1] اس تخلص میں ایک خاص لطف ہے۔ حضرت شاہ گلشن حضرت شاہ محمد وحدت گُل کے مرید تھے۔ اب شجرۂ تخلص ملاحظہ ہو۔

شاہ محمد وحدت	گُل
حضرت شاہ سعد اللہ	گلشن
خواجہ محمد ناصر صاحب	عندلیب
خواجہ میر صاحب	درد
خواجہ محمد میر صاحب	اثرؔ

دیکھو "گُل" کی جلوہ نمائی سے ظہورِ "گلشن" ہوا۔ گلشن نے نالۂ "عندلیب" پیدا کیا۔ نالۂ عندلیب سے "درد" جلوہ افروز ہوا۔ درد سے "اثر"۔ ع این سلسلہ از طلائے ناب ست + این خانہ تمام آفتاب ست

فنِ موسیقی میں کامل مہارت تھی حج سے مشرف ہوئے تھے۔ اُن کی مدح میں فرماتے ہیں سہ

چوں مرقعِ صد بہار از فقرِ من گُل میکند   در فقیری بہرہ مند از فیضِ شاہ گلشنم

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی روح پرفتوح سے طریقۂ محمدیہ حاصل کیا۔ اُن کی تصنیف "نالۂ عندلیب" کا حجم اٹھارہ سو صفحے کا ہے جس کو آزاد نے "ایک رسالہ" لکھا ہے۔ زبان فارسی ہے۔ قصے کے پیرایہ میں معارفِ بلند اور مطالبِ عالیہ بیان فرمائے ہیں۔ موقع موقع پر کثرت سے اشعار درج ہیں۔ وجہ تصنیف خود یہ بیان فرمائی ہے کہ "اکثر آدمی مجھ سے مختلف مطالب اور مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ صوفی طریقت کے جویا تھے۔ مُلّا احکام شرعیہ پوچھتے تھے۔ مثلاً جبر و اختیار کا مسئلہ۔ بعض جوان مذہب شیعہ و سنی کی تحقیق چاہتے تھے۔ بعض اخلاقِ ستودہ کے متلاشی تھے۔ کسی کو عشقِ مجازی کی حکایتوں کا شوق تھا۔ اہلِ عقل کو عقلی پیرایہ کی جستجو تھی۔ اسی عرصہ میں حضرت قبلۂ عالم نے رحلت فرمائی۔ ادائے تعزیت کے لیے اعزہ اور احباب کا مجمع میرے مکان پر ہوا۔ اُسی موقع پر افسانہ کے پیرایہ میں "بزبانِ ہندی" مطالب بالا کے جوابات خواجہ صاحب نے بیان کئے۔ تین شب و روز یہ صحبت رہی۔ اپنے اپنے مطالب کے جواب پاکر سامعین پر عجب عالم طاری ہوا۔ سامعین مُصر ہوئے کہ اُس افسانہ کو قلمبند کردوں۔ عرصہ تک ٹالا۔ آخر اشارۂ غیبی پاکر فارسی زبان میں لکھدیا۔ طریقۂ تالیف یہ تھا کہ عشا کے بعد مخصوص احباب کے روبرو زبانی بیان کرتا۔ میر درد لکھتے جاتے۔ احیاناً وہ نہ ہوتے تو بیدار میرے مرید قلمبند کرتے۔ کبھی وہ بھی نہ ہوتے تو خود میں ہی لکھتا جاتا اس طرح ۱۱۵۳ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی۔ "نالۂ عندلیب" نام پایا۔ میر درد صاحب نے تاریخ لکھی ع

نالۂ عندلیب گلشنِ ماست

کتاب کو پڑھو اور کمال اور بیان کی قوت کا اندازہ لگاؤ۔ خواجہ عندلیب صاحب نے ۶۶ برس کے سِن میں شعبان ۱۱۷۲ھ میں رحلت فرمائی۔ رضی اللہ عنہٗ۔

خواجہ میر درد ۱۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم اپنے والد ماجد سے کی تفصیل تحصیل نظر سے نہیں گزری لیکن تصانیف شاہد ہیں کہ نقلی اور عقلی علوم میں کامل تھے۔ خصوصاً علم الکتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ تصوف۔ اور معقولات میں پوری مہارت حاصل تھی۔ ابتدائے شباب میں دنیا دار رہے۔ جاگیر اور معاش کے اہتمام میں پوری تگ و دو کی۔ امرائے شاہی اور مقربان بارگاہ کے ناز اُٹھائے۔ ۲۰ برس کی عمر میں جذبۂ

حق نے اپنی طرف کھینچا۔ سب کو چھوڑ کر اُدھر جھکے۔ لباس درویشی پہن کر آستانۂ جاناں پر سر جھکا دیا۔ ۳۹ برس کی عمر میں خواجہ عندلیب صاحب کی رحلت کے بعد مسند نشیں ارشاد ہوئے۔ اور آخر دم تک قدم نہ ہٹا۔ مصیبتوں کے دریا چڑھے اور اُترے۔ یہاں پائے استقامت کو جنبش بھی نہ ہوئی۔ انہی مصائب میں "حملۂ نادری" بھی تھا۔ خواجہ صاحب بارھویں صدی ہجری کے اولیائے کبار سے ہیں۔

تصنیف کا شوق ابتدائے عمر سے تھا اور آخر عمر تک رہا۔ پندرہ برس کی عمر میں بحالت اعتکاف رسالہ "اسرار الصلوٰۃ" لکھا۔ اُنتیس ۲۹ برس کی عمر میں رسالۂ "واردات" لکھا۔ رسالہ مذکور ۱۱۷۲ھ میں ختم ہوا۔ اس کے بعد ایک مدت تک اُس کی شرح "علم الکتاب" لکھی۔ علم الکتاب کے بعد "نالۂ درد" لکھا جو ۱۱۹۰ھ میں پورا ہوا۔ میر اثر نے تاریخ کہی۔ ع ۔ نالۂ عندلیب دردِ من ست۔ "نالۂ درد" کے بعد ۱۱۹۳ھ میں رسالۂ "آہِ سرد" ختم ہوا۔ تاریخ از میر اثر۔ ع آہِ سرد ما نماید گرمی رفتار ما۔ "آہِ سرد" کے بعد رسالۂ "دردِ دل" کی نوبت آئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ رسالۂ "شمع محفل" لکھا گیا۔ دونوں کو ساتھ لکھنے کی وجہ یہ تحریر فرمائی ہے کہ "نالۂ درد" اور "آہِ سرد" کی تالیف کے بعد جب رسالۂ "دردِ دل" لکھنا شروع کیا تو خیال آیا کہ اس کے بعد ایک رسالہ "شمع محفل" کے نام سے لکھوں گا۔ مگر چونکہ سِنِ باسٹھ ۶۲ برس کا ہو چکا فرصت مفقود۔ لہٰذا دونوں کو ساتھ ساتھ لکھنا شروع کر دیا۔ صفر ۱۱۹۹ھ میں دونوں رسالے ختم ہوئے۔

فنِ موسیقی میں خواجہ صاحب کو پورا دخل تھا۔ میاں فیروز خاں گویوں کا اُستاد حاضر ہو کر فن کے نکتے حل کرتا۔ دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو ہر مہینے میں ایک مجلس سماع مکان پر ہوتی اس طرح کہ قوال بلا طلب حاضر ہو جاتے اور جب تک اُن کا دل چاہتا سُناتے اور چلے جاتے۔ نہ بلائے جاتے نہ روکے جاتے۔ سماع کی نسبت خواجہ صاحب فرماتے ہیں: "سماع من جانب اللہ ست وحق بریں امر ہمہ وقت گواہ کہ خود بخود گویندگاں می آیند و مادام کہ می خواہند می سرایند۔ نہ آنکہ فقیر ایشاں را می طلبد وشنیدن سرود را چوں دیگراں عبادت می فہمد بلکہ ہماں معاملہ نہ انکار میکنم نہ ایں کار میکنم دربیش ست و عقیدۂ من ہماں ست کہ عقیدہ بزرگانِ من ست۔" (نالۂ درد۔ ۳۷)

۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ کو انتقال فرمایا اور اپنے والد ماجد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ تاریخ وفات از بیدار

تاریخ۔ قطعہ

آفتابِ اُمتِ دینِ محمدؐ خواجہ میر   مظہرِ علمِ علی و وارثِ اثنا عشر

حضرتِ دردؔ آنکہ از دردِ فراقِ عندلیب | نالۂ یا ناصرش میکرد بردلہا اثر
حیف گردُ نیا بعمر شصت و ہشتم سالگی | جانبِ اعلاء علیئین اوکردہ سفر
بندۂ بیدار کان ہست از غلامانش یکے | جُست از وقت وصال درو ز وماہش خبر
یک پہر شب ماندہ ہاتف کرد وا ویلا و گفت | ہائے بود آدینہ و بست چہارم از صفر

اس تاریخ میں خواجہ صاحب کی عمر اڑسٹھ برس کی لکھی ہے۔ حالانکہ خود خواجہ صاحب کے بیان سے چھیاسٹھ برس معلوم ہوتے ہیں۔ جیساکہ آگے چلکر معلوم ہوگا۔ مزار شہر پناہ کے باہر شاہ جی کے تالاب کے متصل ہے۔ میں بھی فاتحہ خوانی سے مشرف ہوا ہوں۔ والحمدللہ علیٰ ذالک نزع میں یہ مصرع خواجہ صاحب کے زبان پر تھا۔ ع۔ دردؔ ہم جاتے ہیں پر چھوڑے اثر جاتے ہیں۔ میر اثرؔ خواجہ صاحب کے بعد سجادہ نشیں ہوئے۔ یہ سلسلہ خواجہ محمد نصیر متخلص بہ "رنج" تک جاری رہا جو خواجہ صاحب کے نواسے تھے۔ خواجہ صاحب کے صاحبزادے ضیاء الناصر تھے۔ تخلص "الم" تھا۔

تصانیف | بیان بالا سے خواجہ صاحب کی تصانیف کے یہ نام معلوم ہوئے۔ اسرار الصلوٰۃ۔ رسالہ واردات۔ علم الکتاب۔ نالۂ درد۔ دردِ دل۔ آہ سرد۔ شمع محفل۔ انکے علاوہ دیوان فارسی۔ دیوان اردو۔ جملہ تصانیف بالا شائع ہو چکی ہیں۔

اسرار الصلوٰۃ چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں نماز کے ارکان پنجگانہ کے اسرار سیر سیر کرکے بیان فرمائے ہیں۔
واردات۔ یہ ایک سو گیارہ واردات کا مجموعہ ہے۔ ہر وارد کا نام جداگانہ ہے۔ مثلاً۔ وارد اول: "فاتح الواردات" وارد ثانی: "نورٌ من اللہ"۔ علیٰ ہذا القیاس۔ وجہ تالیف "واردات" کی یہ ارشاد فرمائی ہے کہ اکثر اوقات غلبۂ حالات میں (جو عبارت ہے شدت مشاہدہ کی حالت سے اور استیلاء تالّہ سے) جو معانی دل پر منکشف ہوتے تھے وہ رباعیوں کی صورت میں منظوم ہو جاتے تھے۔ جب یہ رسالہ تمام ہو گیا تو ۱۱۷۲ھ میں خواجہ عندلیب صاحب کی خدمت میں پیش ہوا اور پسند فرمایا گیا۔ رسالۂ واردات میں معرفت و حقیقت کے مطالبِ عالیہ بیان فرمائے ہیں۔ ہر وارد کا ایک دیباچہ ہے۔ اول و آخر رباعی ہے۔ درمیان میں شارحانہ نثر۔ نمونہ۔ وارد اوّل۔

رُباعی اوّل

درخلوتِ ماکہ رشکِ صد انجمن ست | با خویش زباں چو شمع گرم سخن ست

عالم آئینہ خانہ است و ما را　　　ہر سو کہ اشارت ست با خویشتن ست

رُباعی آخر کی

از فیض تو ہر خرابہ معمور آمد　　　وز لطف تو ہر غمزدہ مسرور آمد

بخت سیہش رخت ز عالم بربست　　　ہر سایہ کہ زیر سایۂ نور آمد

وارد دویم۔ رُباعی آخر کی۔

ہستی و عدم خراب میخانہ اوست　　　امکان و وجوب مست پیمانہ اوست

چشم دل تو اگر حقیقت بین ست　　　ہر ذرۂ خلق روزنِ خانہ اوست

"علم الکتاب" رسالہ بالا کی شرح ہے جو میراثر کی فرمائش سے لکھی گئی۔ باریک خط کے بڑے بڑے صفحے ۸۴۹ ہیں۔ خواجہ صاحب کے علمِ الٰہی کا بتحر اور کمالاتِ معرفت کی حقیقت اِس تصنیف سے واضح ہوتی ہے۔ جا بجا عربی طویل عبارتیں بے تکلف غایت بلاغت کے ساتھ مثلِ چشمہ رواں ہیں۔ مطالب حقہ کا ہجوم ہے۔ آیات اور احادیث اِس روانی اور آسانی سے ہر موقع پر درج ہوتی جاتی ہیں کہ پڑھنے والے کا قلب اُنکے انوار سے پرنور و معمور ہو جاتا ہے سلوک کے مسائل کو آیات و احادیث سے مجتہدانہ اور عارفانہ قوت کے ساتھ ثابت و مدلل فرمایا ہے۔ "نالۂ درد" میں فرماتے ہیں کہ "نالۂ عندلیب" اور "علم الکتاب" طریقۂ محمدیہ کے سلوک کے لیے کافی ہیں۔ یہ کتاب متانت و قوت تحریر میں شاہ ولی اللہ صاحب کی بہترین تصانیف کے ہم پلہ ہے۔

"نالۂ درد" "علم الکتاب" کے بعد لکھا گیا دیباچہ میں فرماتے ہیں۔

"علم الکتاب کے ختم ہونے پر جو مطالب" قلبِ حیران پر تراوش کرتے تھے اُن کو میراثر جمع کرتے گئے۔ جب مجموعہ تیار ہو گیا "نالۂ درد" نام رکھا۔ اِس میں لفظ ناصر کے عدد ۳۴۱ نالے ہیں۔ یہ رسالہ سوز و گداز اور دلوں تپتی سے معمور ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

درد می بارد از رسالۂ درد　　　شرح دردِ دل ست نالۂ درد

"آہ سرد"۔ اس میں بھی ۳۴۱ سرد آہیں ہیں۔ "نالۂ درد" و "آہ سرد" دونوں مل کر گویا ایک کتاب ہیں۔

"نالۂ درد" "آہِ سرد" دونوں ختم ہوگئے۔ مگر دردِ دل بدستور تھا۔ ناچار "دردِ دل" لکھا۔ اس میں ۳۴۱ درد ہیں۔ ہر درد میں مطالبِ فاں کی شرح ہے۔
شمعِ محفل۔ اس میں ۳۴۱ نور ہیں اور ہر نور معارفِ بلند سے معمور۔ رسالہ کا آغاز خواجہ صاحب کی عمر کے باسٹھویں سال میں ہوا تھا۔ چھیاسٹھ برس کی عمر تک دردِ دل کے ساتھ اس کی تحریر جاری رہی۔ اس رسالہ کا خاتمہ حیرت خیز اور واقعہ عبرت انگیز ہے۔ خاتمہ میں فرماتے ہیں۔ "اب میری عمر کا چھیاسٹھواں سال ہے اور یہ رسالہ ختم ہو رہا ہے۔ مبارک اسم اللہ کے بھی عدد ۶۶ ہیں۔ صحیفۂ واردات ۱۱۷۲ھ ہجری میں ختم ہوا تھا اُسی سال والد عالی مرتبہ نے چھیاسٹھ برس کی عمر میں رحلت فرمائی تھی حُسنِ اتفاق کہ اِس رسالہ کا خاتمہ امسال ہوا جو میرا سال ارتحال ہے یہ رسالہ رسالۂ "شمعِ محفل" کے ساتھ ۱۱۹۵ھ میں شروع ہوا تھا۔ ۱۱۹۹ھ میں ختم ہو رہا ہے۔ ظاہراً یہ خاتمہ توام ہے سکوت خاتمہ بالخیر راقم رسالہ سے۔ خواجہ صاحب کے کلام کا خلاصہ ختم ہوا۔ دیکھو اسی صفر کی ۲۴ تاریخ کو خواجہ صاحب نے رحلت فرمائی۔ یہ کیا تھا۔ سائنس کے رمز شناس سوچیں۔ "شمعِ محفل" کا نور (۳۲۹) اِس راز پر روشنی ڈالتا ہے۔ جہاں فرماتے ہیں کہ "مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ سال ارتحال و حال انتقال تجھکو پیشتر سے بتلایا جائیگا۔ یہ داجل ناگہاں نہیں پہنچیگا"۔ چاروں مذکورۂ بالا رسالوں میں یہ التزام ہے کہ سوائے اپنے اشعار فارسی کے اور کسی شاعر کا کلام درج نہیں کیا۔

"دیوانِ فارسی"۔ دیوانِ فارسی مختصر ہے۔ ۱۳۰۹ھ ہجری میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوا ہے۔ غزلیں ہیں۔ رُباعیاں ہیں۔ مخمس وغیرہ بھی ہیں۔ زبان کا وہی انداز ہے جو فارسی گو شعرائے ہند خانِ آرزو وغیرہ کا ہے۔ معرفت کی قوت کے لحاظ سے بہت بلند پایہ ہے۔ ایک شعر سن لیجئے۔

خند منشاءِ ظہورِ دو عالم وجودِ ما
جوشید نشائتین ز جوشِ شرابِ ما

اِس شعر سے زورِ کلام اور قوتِ نسبت کا اندازہ کیجئے۔ اگر "نالۂ درد" وغیرہ کے اشعار بھی شامل دیوان ہو جائیں تو ایک ضخیم مجموعہ مرتب ہو جائے۔ نمونہ غزل فارسی۔

غزل

جوشش زد بادۂ توحید بہ میخانۂ ما — بحر دارد بہ گرہ قطرۂ پیمانۂ ما

بیخودی پردہ گشائے حرمِ دل باشد | بستہ احرامِ رہش لغزشِ مستانۂ ما
دیدہا آئینہ باشد بامیدے کہ کند | جلوۂ یار قدم رنجہ بکاشانۂ ما
زینت و زیب نے ناں باد مبارک بزناں | سازِ دنیا نکند ہمتِ مردانۂ ما

منتِ طبعِ رسا دردؔ بمنت نکشم
آشنا کردہ بما معنیٔ بیگانۂ ما

غزل

آئینہ ایم فرما تا در حضور آئیم | ہر جلوۂ کہ داری در خود ترا نمائیم
عرفانِ تیز بیں را حیرت گرفت آخر | اکنوں بہ نور ایماں چشمِ یقیں کشائیم
از آشنائیے ما بیگانگی ست او را | بیگانہ وار ہستیم از بسکہ آشنائیم
ما چشمِ نقشِ پائیم دید قصور داریم | گو در رہش فتادیم اما برہ نیائیم
او دلبر و دل آزار ما دل ز دست دادہ | یارب چہ پیش آمد آمادۂ بلائیم
ما از وفا نپرسیم تو از جفا نگوئی | تا چند آزمائی تا چند آزمائیم

یاراں ز ہر بانی دانند ہرچہ دانند
ما خوب می شناسیم اے دردؔ آنچہ مائیم

متفرق

دردؔ سلطانِ بحر و بر گشتم | کہ لبِ خشک و چشمِ تر دارم

ولہٗ

صبحِ روزِ فراقِ شام بود | اے شبِ وصل شام تو سحرست

(ادا نور خاں)

ولہ

فروغ ماہ در شبہا تواں دید　　بہندوستاں نماید نورایاں

ولہ

در دست چراغنے کہ دریں راہ بگیرم　　آئینہ بکف از دل آگاہ بگیرم

"دیوان اُردو"۔ اس کا بیان آگے آتا ہے۔

ادبِ اُردو خواجہ صاحب اُردو شعراء کے تیسرے دور میں ہیں۔ میر و میرزا معاصر تھے۔ دور سوم کے شعرا کی نسبت آزاد آبِ حیات میں لکھتے ہیں "زبان اُردو ابتدا میں کچا سونا تھی۔ اِن بزرگوں نے اُسے کدورتوں سے پاک صاف کیا اور ایسا بنا دیا ہے کہ جس سے ہزاروں ضروری کام اور آرائشوں کے سامان حسینوں کے زیور بلکہ بادشاہوں کی تاج و افسر تیار ہوتے ہیں ...... یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔ انکا تکلف بھی اصل لطافت پر کچھ تلطف زیادہ کریگا اوس کی خوبی پر پردہ نہو گا۔ تم میر صاحب اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہونگے"۔ آگے چل کر لکھتے ہیں "اپنے اُستادوں اور بزرگوں سے یہی سُنا کہ مرزا جان جاناں۔ سودا۔ میر۔ خواجہ میر درد۔ یہ چار شخص تھے کہ جنھوں نے زبان اُردو کو خراط اوتارا ہے"۔

کلام بالا سے خواجہ صاحب کے ادبی صفات یہ واضح ہوئے۔ زبان کو پاک اور کلام کو آراستہ کیا۔ خراط اوتارا۔ اِس سے بھی بڑھکر شہادت میر تقی میرا ور میر حسن کی ہے۔ میر صاحب جب اکبر آباد سے دلی آئے تو خواجہ صاحب کی خدمت میں شرف اندوز ہوتے رہے۔ اُنکے مشاعرہ میں شریک ہوکر دارالخلافہ کے مذاق سے آشنا ہونے اور اہل زبان کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کا موقع انکو ملا۔ میر صاحب کی ترقی دیکھ کر خواجہ صاحب فرماتے "میر محمد تقی تو میر مجلس خواہی شد"۔ جب وہ مشاعرہ خواجہ صاحب کے یہاں بند ہوگیا۔ تو میر صاحب نے اُنکی فرمایش سے اپنے یہاں مقرر کیا۔ اپنے مشاعرہ کی نسبت کہتے ہیں "واللہ کہ بذات ہمیں بزرگ ست"۔ میر صاحب کو صاف اقرار ہے کہ انکا کمال خواجہ صاحب کے پاک انفاس کا ممنونِ کرم ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں "الحمدللہ والمنۃ کہ حرف آں سر سلسلۂ خدا پرستاں مؤثر افتاد۔ باطنِ آں خضرِ قافلۂ اہلِ عرفاں کہ از ظاہرش ظاہر ترست زود کار کرد"۔ (دیکھو تذکرہ میر تقی۔ حالات خواجہ صاحب) میر حسن نے بھی ابتداءً ذوقِ شاعری کی پختگی خواجہ صاحب کی صحبت میں حاصل کی

کریم الدین لکھتے ہیں "بچپن سے میر حسن کو شوق نظم کا تھا۔ جب اِس شوق کی ترقی چاہی خواجہ میر درد کی صحبت میں رہے اسی فیض صحبت سے وہ اپنے ارادہ پر مضبوط اور قائم رہے"۔ (ترجمہ کا سنڈ ڈی ٹاسی) خود میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "میرے اُستاد میر ضیا رہیں مگر مجھ سے اُنکے طرز کا کما حقہٗ نباہ نہو سکا۔ اِس لیے میں نے دوسرے بزرگوں کی (مثل خواجہ میر درد۔ میرزا رفیع سودا۔ اور میر تقی میر) پیروی کی"۔ خواجہ صاحب کی خصوصیت خاص یہ ہے کہ اُردو شاعری کے قالب میں حقیقت و معرفت کی روح پھونکی۔ مردہ جسم کو زندہ کیا۔ نمایاں وصف یہ ہے کہ اُردو ادب میں مذاقِ صحیح پیدا کیا۔ میر تقی میر اور میر حسن اُن کے صحبت یافتہ ہیں۔ اثر اور قائم اُن کے شاگرد ہیں۔ نیز فراق بھکاری داس۔ عزیز نثار۔ الم صاحبزادہ ہیں۔ ایک قریبی رشتہ دار شاعر تخلص ہیں۔

میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" افسوس ہے کہ ابتک دستیاب نہیں ہوئی مگر جو اشعار اُس کے محفوظ ہیں اُن سے اور خواجہ حالی کی شہادت سے عیاں ہے کہ مثنوی مذکور ایک نمونہ تھی حُسنِ ادب کا۔ آبحیات میں آزاد نے تصریح کی ہے کہ میر حسن جو اندازِ بیان دِلّی سے لائے تھے وہ اُن کے خاندان نے آخر تک قائم رکھا۔ چنانچہ میر انیس کہدیتے تھے کہ "یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضرات لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے" نہ صرف یہ بلکہ اندازِ گفتگو۔ طرزِ معاشرت میں بھی آخر تک امتیاز قائم رہا۔ جن صاحبوں نے میر نفیس اور میرزا اوج کو دیکھا ہے وہ میرے بیان کی تصدیق کرینگے۔ اب یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مثنوی خواب و خیال۔ مثنوی بدر منیر اور مراثی انیس سے جو فخر و شرف ادب اُردو کو حاصل ہوا وہ خواجہ صاحب کے فیضِ تربیت کا ممنون ہے۔

خواجہ صاحب شاعری کی نسبت ایک موقع پر فرماتے ہیں۔ اس سے اندازہ کرو کہ کیسی پاکیزہ شاعری کا مفہوم خواجہ صاحب کے ذہن میں تھا۔ "شاعری ایسا کمال نہیں جس کو مَرد۔ آدمی اپنا پیشہ بنالے اور اُس پر ناز کرے۔ البتہ انسانی ہنروں میں سے ایک ہنر ہے بشرطیکہ صلہ حاصل کرنے اور در بدر پھرنے کا آلہ نہ بنے اور مدح اور ہجو دُنیا کمانے کے لیے نہ کہے ورنہ گداگری کی ایک صورت ہے اور طامعی اور بدنفسی کی دلیل" (نالۂ درد ۲۸) - ایک اور موقع پر فرماتے ہیں "اِس سے پہلے بہت ہی کم آدمی ایسے نظر آتے تھے جو "سلسلہ جُنبانِ سخن" ہوں۔ آپ کہیں دوسروں سے سُنیں۔ دِل بے اختیار چاہتا تھا کہ دل پر جو معارف تازہ وارد ہوتے تھے اُن کو سخن فہم نکتہ سنجوں کے سامنے بیان کروں اور اُن سے ہمکلام ہوں یہ نتیجۂ انسانیت ہے اور نشانِ آدمیت۔ کلام مربوط عجیب لذت رکھتا ہے اور دل کو

شگفتہ کردیتا ہے۔ علمۃ البیان کا یہی خلعت ہے جو خلیفۃ اللہ کو پہنایا گیا ہے۔ پاک فرشتوں کی سجود یہ مشتِ خاک اسی نعمت کی بدولت ہوئی ہے۔ اب معنی فہم انسانوں سے زمانہ بالکل خالی ہو چکا ہے۔ بعض جہلا توحید اس انداز سے بیان کرتے ہیں جو عین الحاد ہے۔ بعض جنگجو مذہب و ملت کی باتیں اس طرح کرتے ہیں جو منشا ، فساد ہو جاتی ہیں۔ کچھ خام طبع باہم مکر جوش اخلاص کا اظہار کرتے ہیں اور بیہودہ گوئی کے معرکے گرم کرتے ہیں عقل و فہم کہاں۔ خدا ایسی صحبتوں کے شر سے محفوظ رکھے "

خود اپنی شاعری کی نسبت فرماتے ہیں "فقیر کے اشعار با وجود رتبۂ شاعری کی رعایت کے۔ پیشۂ شاعری اور اندیشۂ ظاہری کے نتائج نہیں۔ بندہ نے کبھی شعر بدون آمد کے۔ اہتمام آورد سے موزوں نہیں کیا اور بہ تکلف کبھی شعر وسخن میں مستغرق نہیں ہوا۔ کبھی کسی کی مدح یا ہجو نہیں لکھی۔ کبھی فرمایش یا آزمائش سے متاثر ہو کر شعر نہیں کہا "

علم الکتاب صفحہ ۹۱

عشق مجازی کا مفہوم خواجہ صاحب کے یہاں معمولی سطح سے بلند تر ہے۔ فرماتے ہیں " بوالہوسی عشقِ مجازی نہیں ہے اور اس مجاز کو حقیقت کی راہ نہیں کہہ سکتے پیر کی محبت وہ عشقِ مجازی ہے جو مطلوب حقیقی تک پہنچا دیتی ہے۔

ع درد سر افزود از عشقِ بُتاں ؛ دردؔ من میخواستم درد دلے "۔ ایک اور موقع پر فرماتے ہیں " میں کبھی رسمی عشق بازی میں گرفتار نہیں ہوا۔ لیکن دل "عاشقانہ صادقانہ" پایا ہے۔ محبوبوں سے تو کبھی سابقہ نہیں رہا البتہ دوستوں کی صحبت بے تکلفانہ میں وقت گزارا ہے۔ دوستانِ ہمدم جب جمع ہوں اور "محفلِ زندہ دلی" گرم فرمائیں اس " مُردہ دلِ افسردہ خاطر" کو بھی یاد کر لیں اور فاتحہ خیر سے شاد "۔

مضامین بالا سے واضح ہوا ہوگا کہ خواجہ صاحب کی شاعری کی نوعیت اور تخیل شعر کی حقیقت کیا تھی ؟

خواجہ صاحب کا دیوان اُردو مختصر ہے۔ عام طور پر جو مطبوعہ نسخے ملتے ہیں بہت غلط ہیں۔ اسی لیے جناب سید راس مسعود صاحب کو صحیح نسخے کی اشاعت کا خیال پیدا ہوا۔ اور بہت صحیح پیدا ہوا۔ حیدر آباد میں ایک سے زائد قلمی دیوان دردؔ کے نسخے میرے ہاتھ آئے۔ سید صاحب کی فرمائش سے میں نے سید معین الدین صاحب شاہجہاں پوری (مترجم نپولین اعظم وغیرہ) کو تصحیح و مقابلے کی تکلیف دی۔ اہل ادب کو ممنون ہونا چاہیے کہ نہایت محنت و دیدہ ریزی سے اُنھوں نے ایک صحیح نسخہ مرتب فرما دیا اُسی نسخہ سے یہ دیوان طبع ہوا ہے۔ طبع کے بعد جب میں حیدر آباد سے حبیب گنج

آیا تو کتاب خانہ میں ایک قدیم مطبوعہ نسخہ موجود ملا جو دہلی کے مطبع مصطفائی میں ۱۸۵۵ء میں اہتمام سے طبع ہوا تھا۔ یہ نسخہ بہت صحیح ہے اور متعدد صحیح نسخوں کے مقابلہ سے چھاپا گیا تھا۔ میں نے اِس نسخہ سے بھی مقابلہ کرنے کی خواہش سید معین الدین صاحب سے کی اور اُنھوں نے مہربانی سے محنت کر کے مقابلہ کیا۔ یہہ دیکھکر مسرت ہوئی کہ حالیہ مطبوعہ نسخہ قدیم سے بالکل مطابق نکلا صحت میں بھی اور مقدارِ کلام میں بھی۔

خواجہ صاحب کے کلام میں بعض ایسے الفاظ ضرور ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ جو زبان آج فصیح سمجھی جاتی ہے کل اُس کے کتنے الفاظ غیر فصیح اور نامانوس مانے جائینگے۔ لیکن اسی کے ساتھ معرفت اور حقیقت کا رنگ۔ کلام کی پاکیزگی تخیل کی بلندی درد کی چاشنی سوز و گداز کا کُندن ہر جگہ عیاں ہے تاباں ہے اشعار ذیل اس دعوے کے شاہد ہیں:-

غزل

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کی رقم کا	حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
جس مسند عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے	کیا تاب گزر ہووے تعقل کے قدم کا
بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن	آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا
ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب کا	اور دل میں بھروسا ہے تو تیرے ہی کرم کا

مانند حباب آنکھ تو اے دردؔ کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

دیگر

مژگان تر ہوں یا رگِ تاکِ بریدہ ہوں	جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں
کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی	افتادہ ہوں پہ سایۂ قدِ کشیدہ ہوں
ہر شام مثلِ شام ہوں میں تیرہ روزگار	ہر صبح مثلِ صبح گریباں دریدہ ہوں

کرتی ہی بوئے گل تو میرے ساتھ اختلاط ۔۔۔ پر آہ میں تو موجِ نسیم وزیدہ ہوں
چاہے ہی یہ مری تپشِ دل کہ بعد مرگ ۔۔۔ کنجِ مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں

لے درد جا چکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غمزدہ تو قطرہ اشک چکیدہ ہوں

دیگر

ہر طرح زمانے کے ہاتھوں سے ستم دیدہ ۔۔۔ گر دل ہوں تو آزردہ خاطر ہوں تو رنجیدہ
ہم گلشنِ دوراں میں اے خفتگی طالع ۔۔۔ سرسبز تو ہیں لیکن جوں سبزۂ خوابیدہ
اے شورِ قیامت رہ اودھر ہی میں کہتا ہوں ۔۔۔ چونکے ہی ابھی یاں سے کوئی دل شوریدہ
اوروں سے تو ہنستے ہو نظروں ہی ملا نظریں ۔۔۔ ایدھر کو نظر کوئی پھینکی بھی تو دزدیدہ
مجھ پر بھی تو یہ عقدہ تو کھول صبا بارے ۔۔۔ زلفوں نے کسے بھیجا یہ نامۂ پیچیدہ
بدخواہ سبھی عالم گو ہووے تو ہو لیکن ، ۔۔۔ یا رب نہ کسی کے ہوں دشمن یہ دل و دیدہ

کرتا ہے جگہ دل میں جوں ابروئے پیوستہ
اے درد یہ تیرا تو ہر مصرعہ چسپیدہ

دیگر

کاش تا شمع نہ ہوتا گزرِ پروانہ ۔۔۔ تم نے کیا قہر کیا ۔ بال و پر پروانہ
شمع کے صدقے تو ہوتے ابھی دیکھا تھا اسے ۔۔۔ پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثرِ پروانہ
کیوں اُسے آتشِ سوزاں میں لیے جاتی ہے ۔۔۔ سوجھتا بھی ہے تجھے کچھ نظر پروانہ
ایک ہی جست میں لی منزلِ مقصود اُسنے ۔۔۔ راہرو رشک کی جا ہے سفر پروانہ

شمع تو جل بجھی اور صبح نمودار ہوئی
پوچھوں اے درد میں کس سے خبر پروانہ

اُس کی بہارِ حسن کا دل میں ہمارے جوش ہے دیگر فصلِ بہار جس کے ہاں ایک یہ گل فروش ہے

خلوتِ دل نے کر دیا اپنے حواس میں خلل حُسن بلائے چشم ہے نغمہ وبالِ گوش ہے

ہووے تو درمیان سے اپنے تئیں اُٹھائیے بار نہیں ہے اور کچھ سر ہی وبالِ دوش ہے

نالۂ و آہ کیجیے خونِ جگر ہی پی جیے عہدِ شباب کہتے ہیں موسمِ نا و نوش ہے

خیر تجھے جو چاہیے بدرقہ جنوں نہ چھوڑنا ہم نے جہاں کی سیر کی۔ رہزنِ خلق ہوش ہے

غیرِ ملال زاہدا۔ کیا ہے طریق زہد میں دل ہو شگفتہ جس جگہ۔ کوچۂ مے فروش ہے

اپنے تئیں تو کام کچھ خرقہ و جامہ سے نہیں

دردؔ اگر لباس ہے دیدۂ عیب پوش ہے

دیگر

آفتِ جان و دل تو یاں وہ بُتِ خود فروش ہے پہلے ہی جس کے پیشکش۔ صبر و قرار و ہوش ہے

دل کو سیاہ مست کر کچھ بھی تجھے جو ہوش ہے کہتے ہیں کعبہ اس کو۔ اور کعبہ سیاہ پوش ہے

کس کی یہ ہوتی ہے صبا گفت و شنید باغ میں غنچے سبھی وہاں ہیں۔ گل بھی تمام گوش ہے

آتشِ گل جنوں مرا گرم کرے سو یہ نہیں سینہ ہمیشہ آگ ہے دل میں سدا ہی جوش ہے

حادثۂ زمانہ کیا تیری جفا سو کیا بلا ہم کو سپہرِ مت ڈرا نیش بھی یاں تو نوش ہے

ہم نے تو ایک معصیت چاہی چھپے نہ چھپ سکی اپنے گناہ کو ترا عفو ہی پردہ پوش ہے

آہ کہیں یہ ناتواں حال کرے سو کیا بیاں منہ پہ ہے مہر خاموشی دل میں بھرا خروش ہے

دور نہیں ہوا ہمیں رنجِ شعور سا قیا اک دو سہ جام اور بھی باقی ابھی تو ہوش ہے

محنت و رنج و غم سے یاں دردؔ نہ جی چھپائیے

بار سبھی اُٹھائیے جب تئیں سر ہے دوش ہے

آخر میں یہ لکھ دینا ضروری ہے کہ جو حالات اس مقدمے میں لکھے گئے ہیں اُن کا ماخذ خود خواجہ صاحب کی تصانیف ہیں بعض حالات یا مضامین ایسے بھی درج ہوئے جو دوسری کتابوں سے ماخوذ ہیں اُن کا حوالہ موقع پر دیدیا گیا ہے۔

میں ممنون ہوں کہ سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی سے قیمتی مدد ملی ہے۔ ناشکری ہوگی اگر میں نہ لکھوں کہ خواجہ صاحب کی نادر اور نایاب تصانیف (علم الکتاب) و نالۂ درد وغیرہ) اور خواجہ عندلیب صاحب کی نالۂ عندلیب کی اشاعت کی سعادت نواب سیّد نور الحسن خاں مرحوم بھوپالی کو نصیب ہوئی۔ یہ دین و علم کی ایسی بیش بہا خدمت تھی جو ہمیشہ اہل دل کو اُن کا ممنون رکھے گی۔ جزاہ اللہ خیرا

اللہ بس۔ باقی ہوس

نوٹ۔ یہ دیوان جس کا یہ مقدمہ ہے سلسلۂ آصفیہ مطبع نظامی بدایون کا تیسرا نمبر ہے۔ قیمت مجلد ۱۲؍۔ غیر مجلد عہ

مرے حُسن کے لئے کیوں مرے؟

(نتیجۂ فکر جناب محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے)

(۱)

نہ بھلے کی تھی نہ بُرے کی تھی مجھے کچھ جہاں کی خبر نہ تھی   تمہیں عیش کا ہی جو دھیان تھا تمہیں میری چاہ اگر نہ تھی

مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۲)

بہت اپنی چاہ جتا جتا مرے دل کو موہ کے لے لیا   مرے واسطے یہ بہشت تھی تمھیں دل لگی تھی یہ کھیل تھا

مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۳)

مری چاہ تھی بڑی قیمتی میں غریب تھی یہ امیر تھی   تھے امیر تم یہ نہ چاہ تھی میں امیر تھی یہ فقیر تھی

مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۴)

نہ تھا اس جہان میں آسرا مری جان تھی یہ جہان تھا   مرے سُکھ تمہیں تمہیں چین تھے تمہیں چاہ ہے یہ گمان تھا

مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۵)

مرے حسن کی جو بہار تھی مری کھل رہی تھی کلی کلی　　یہ تمھیں پہ میں نے نثار کی مرا دھن لیا مری جان لی

مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۶)

مری چاہ لی مرا دل لیا جو طلب کیا وہ تمھیں دیا　　جونہی حسن سے مرے دل بھرا وہ پھری نگاہ وہ دل پھرا

مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۷)

تمھیں چاہ اور کی جب ہوئی مری وہ بہشت تو جا چکی　　مگر آرزو یہ ضرور تھی تمھیں دیکھ لیتی کبھی کبھی

مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۸)

مرا پاش پاش یہ دل ہوا مری چاہ کا وہ دیا بجھا　　مرے دل کو تم نے یہ کیا کیا نہیں اب بھی وہ کسی اور کا

مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۹)

نہیں اب بھی وہ کسی اور کا یہ نہ اگلا سا مرا دل رہا　　تمھیں یاد آؤں میں پھر اگر تو یہ پاؤ گے کہ وہ خواب تھا

مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

(۱۰)

مرے دل سے ہوگا یہ کب بھلا تمھیں دے سکوں کوئی بددعا　　وہ ہوا جو ماتھے پہ تھا لکھا مرے دل سے آئے گی پر صدا

مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟ نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے!

اُردو رسمِ خط میں اصلاح

از

جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی پرنسپل عثمانیہ کالج حیدرآباد (دکن)

اُردو رسم خط کی اصلاح کے متعلق متعدد مضامین اُردو کے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ کافی بحث ہونے کے بعد ایک مجلس حیدرآباد میں امور بحث طلب کے فیصلے کے لئے منعقد ہوئی جس میں اصحاب ذیل شریک تھے۔

ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی، ایم اے، پی ایچ ڈی پرنسپل عثمانیہ کالج، مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے ناظم دارالترجمہ، مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ، مولوی وحیدالدین صاحب سلیم پروفیسر عثمانیہ کالج، مولوی سید احمد علی صاحب ناظر تعلیمات ضلع ناندیر، مولوی سجاد مرزا صاحب بی اے (کینٹب) پرنسپل مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ اورنگ آباد۔ عبدالحق۔

بعض صاحب بوجہ بُعد اور بعض اس وجہ سے کہ تاریخ جلسہ عید کے متصل تھی۔ شریک جلسہ نہ ہو سکے ان میں سے بعض صاحبوں نے بذریعہ تحریر اپنی رائے بھیج دی یا جن خیالات کا اظہار وہ اپنے مضامین میں فرما چکے تھے اُن کا حوالہ دیدیا۔ ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی نے جو تجاویز جلسے میں پیش کیں وہ ارکان مجلس نے تقریباً سب منظور کرلیں جو اس مضمون کے پڑھنے سے واضح ہونگی۔ ڈاکٹر صاحب نے اِن تجاویز میں اُردو ٹائپ کی مشکلات کو پیش نظر رکھا ہے اور ان کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس میں سہولت پیدا کی جائے۔ مثلاً اُنھوں نے اعراب بجائے حروف صحیح کے حروف علت پر رکھے ہیں۔ یعنی ٹائپ میں وَ اور یَ مع اعراب رہیں گے۔ جہاں ضرورت ہوگی لگا دیئے جائیں گے۔ اگر برخلاف اس کے مروجہ طریقہ پر عمل کیا جائے تو تمام حروف مع اِن اعراب کے الگ بنانے پڑیں گے اور اس سے ٹائپ میں جو دقت

بڑھ جائے گی وہ ظاہر ہے۔ امید ہے کہ جو صاحب اس مضمون کو مطالعہ فرمائیں گے وہ اس اصول کو مدنظر رکھینگے
علاوہ اس کے ارکان مجلس نے بالاتفاق اوقاف کے لئے مفصلۂ ذیل علامات اور اسمار مقرر کئے

انگریزی نام		اردو نام	علامت
فل اسٹاپ (	Full Stop .) کے لئے	وقفہ	–
کولن (	Colon :) ″	نیم وقفہ	:
سیمی کولن (	Semi-colon ؛) ″	رابطہ	؛
کاما (	Comma ،) ″	سکتہ	،
ان ورٹڈ کاماز	Inverted Commas " ") ″	واوین	" " (عبارت کے اوپر)
نوٹ آف ان ٹروگے شن	Note of Interrogation ؟) ″	سوالیہ	؟
نوٹ آف انٹرجیکشن	Note of Interjection !) ″	ندائیہ	!
بریکٹس	Brackets ( )) ″	قوسین	( )
	Dots ......) ″	نقطے	.....

املا کے متعلق بعض امور کسی دوسرے جلسے میں فیصلے کے لئے پیش ہونگے۔

اڈیٹر

اُردو، تحریر میں دو قسم کی خرابی ہے: (ا) ایک حرُوفِ صحیح سے (۲) دوسری حرُوفِ علّت سے تعلق۔

(ا) اُردُو کی الف بے میں کئی کئی حرفوں کی آواز ایک ہے؛ جیسے آ اور عَ کی آواز ایک ہی ہے۔ اِسی طرح تَ اور طَ کی، ثَ، سَ اور صَ کی، حَ اور ہَ کی، ذَ، زَ، ضَ، اور ظَ کی آواز ایک ہے اُردُو کی ضرُورت کے لئے صرف آ، تَ، سَ، ہَ اور زَ کافی ہیں اور باقی حرف (عَ، طَ، ثَ، صَ، ذَ، ضَ اور ظَ) بے ضرُورت ہیں اور اِسی لئے یہ حرف صرف عربی لفظوں کے لکھنے میں کام آتے ہیں۔ اِن حرفوں کے وجود سے لکھنے والے کو تکلّف ہوتا ہے لیکن لکھی ہوئی عبارت کے پڑھنے میں کوئی دِقّت نہیں ہوتی

پس اِس وقت اِن ٹھیٹ عربی حرفوں کو میں خارج از بحث تصوّر کرتا ہوں اور اپنی تقریر کو دوسری قِسم کی خرابی کے رفع کرنے کی تجویزوں تک محدود رکھتا ہوں۔

(۲) اُردو کی الف بے میں حرفِ علّت کم ہیں اس لئے (ا)، ایک حرفِ علّت کئی آوازوں کے لئے لکھا جاتا ہے؛ اور (ب) خفیف علّت کے نشان یعنی اعراب لکھے ہی نہیں جاتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ساری تحریریں تلبیس پیدا ہو گئی ہے اور پڑھنے والے کو عبارت کے صحیح پڑھنے میں مشکل سے کامیابی ہوتی ہے اور اِسی لئے رسمِ خط میں اصلاح کی ضرورت لاحق ہے۔

اصلاح کا مقصود

(۱) موجودہ کتابت کے اِلتباس کو دُور کرنا؛

(۲) التباس کے دُور کرنے کو ایسی علامتیں یا نشان مقرر کئے جائیں جو نامانوس نہ ہوں؛

(۳) رسمِ خط کے مقرر کرنے میں یہ لحاظ رکھا جائے کہ ٹھپّے کے چھاپے کے لئے جہاں تک ہو سکے آسانیاں پیدا ہوں؛

(۴) جہاں تک ہو سکے حرفوں کو اِعراب (یعنی زبر، زیر، پیش) سے مستغنی کرنا

اصلاح کی تدبیریں

(۱) جہاں تک ہو سکے ہر لفظ الگ الگ لکھا جائے۔ کئی لفظوں کو ملا کر لکھنے سے چھپائی میں بھی دقّت ہوتی ہے اور پڑھنے میں بھی "آپنے"، "تمنے"، "مینے"، "آپکیخدمتمیں"، "عرفانعلیخانصاحب"، "هادیعلیبیگصاحب"، "جسدن"، "جسکو"، "اُسیدن"، "مجھسے"، "نکیجئیگا"، "نجائیگا"، کو اُسی طرح غلط سمجھنا چاہیئے جیسے عربی میں "سوفتعلمون" غلط سمجھا جاتا ہے۔ صحیح صورتیں یہ ہوں گی؛ "آپ نے"، "تم نے"، "میں نے"، "آپ کی خِدمت میں"، "عرفان علی خاں صاحب"، "ہادی علی بیگ صاحب"، "جِس دِن"، "جس کو"، "اُسی دِن"، "مجھ سے"، "نہ کیجئے گا"، "نہ جائے گا"، "سَوفَ تَعلَمُونَ"، اِسی طرح "کان پور" "ناگ پور" "بھرت پور"، "اُودے پُور"، "جے پُور"، "شاہ جہان پُور"، "فرّخ نگر" وغیرہ لکھنا چاہیئے۔ اگر اِس قاعدے

پر پابندی کے ساتھ عمل کیا جائے تو ٹھپّے کے چھاپے کے لئے حرف جوڑنے میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ دوسرے یہ کہ بہت سے حرف اِعراب سے مستغنی ہو جائیں گے۔

(۲) ہر لفظ کا اخیر حرف اُردو میں ساکن ہوتا ہے۔ اِس لئے اُس پر جزم لگانے کی ضرورت نہیں۔

(۳) سوا لفظ کے اخیر حرف کے جس حرفِ صحیح پر کوئی علامت یا اِعراب نہ ہو اُسے عموماً مفتوح پڑھنا چاہیئے۔

(۴) لفظ کے اخیر حرف کے سوا جو حرفِ صحیح ساکن ہو اُس پر جزم کا نشان ضرور لگانا چاہیئے۔ البتہ اُردو فعل کے مادّے میں جو ایسے حرف آئیں اُن کو جزم لگائے بغیر چھوڑ دینے میں کوئی حرج نہیں جیسے کھیلنا، کاٹنا، جھپٹتا ہے، لپکتا تھا وغیرہ میں اگر ل، ٹ، ک پر جزم نہ ہو تو بھی اِن کے پڑھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔ یہی حال اُن اُردو لفظوں کا ہے جو بہت عام ہیں جیسے اپنا دوسری، پانچواں وغیرہ۔

(۵) ہر مُشدّد حرف پر تشدید کا نشان ضرور لگانا چاہیئے۔

(۶) جب آ مضموم یا مکسور ہو اور اُس کے بعد کا حرف، حرفِ صحیح ہو تو آ پر اعراب ضرور لگانا چاہیئے۔ جیسے اِس، اُس، اِدھر، اُدھر۔

(۷) اُردو میں اگر آ یا وٓ کے بعد ہمزہ آئے تو اُس ہمزہ کے لئے کوئی شوشہ نہ بنایا جائے بلکہ آ کے بعد ہی اُس کے برابر ہمزہ لکھا جائے۔ جیسے آءِی، آءِ ے، کوءِی، بھاءِی، جاءِ ے، لاءِ ے، سوءِ نے، کھوءِ ے وغیرہ

(۸) دو لفظوں کے درمیان مناسب فاصلہ دیا جائے۔

(۹) جو مُرکّب لفظ دو یا تین لفظوں سے مل کر بنے ہوں اُن کے اجزا الگ الگ لکھے جائیں۔ لیکن اُن کے درمیان فاصلہ نہ دیا جائے۔ جیسے پن گھٹ، پوَن چکّی، دِل کش، دل چسپ وغیرہ (مگر دِل ہیں دِل پر) البتّہ جو دو لفظ ایک دوسرے کے ساتھ ایسے وصل ہوئے ہیں کہ کوئی آواز جاتی ہی رہی ہے وہ ملا کر لکھے جائیں گے جیسے دِلارام، دِلازار، سیلاب وغیرہ

(۱۰) فارسی اِضافت کے کسرے کو ہمیشہ تحریر میں لانا چاہیئے۔ یہ جو دس قاعدے بیان ہوئے، تھوڑے

سے اہتمام سے اِن پر آسانی سے عمل ہوسکتا ہے اور اِن میں کوئی ایسی نئی بات نہیں جو نامانوس ہو۔ اب حرف وٓ اور یٓ کی کتابت کا معاملہ باقی ہے جو نہایت اہم ہے۔ اُس کے لئے یہ گیارھواں قاعدہ میں نے تجویز کیا ہے:۔

(۱۱) وٓ اور یٓ کی مختلف آوازوں کے لئے صورتیں بھی مختلف ہوں اور وہی ہمیشہ استعمال کی جائیں لوہے کے چھاپے کے لئے اِن میں سے ہر صورت کا ایک الگ ٹھپّا ڈھال لیا جائے۔

وٓ اور یٓ جب حرفِ علّت ہوں تو اُن کی چار چار آوازیں ہوتی ہیں اور جب حرفِ صحیح ہوں تو ایک ایک آواز یعنی واو کی کُل پانچ آوازیں ہوئیں اور اتنی ہی یٓ کی، مگر یہ یاد رہے کہ یٓ کی تین آوازوں میں سے ہر آواز کے لئے دو صورتیں اس وجہ سے ہو جاتی ہیں کہ یٓ لفظ کے آخر میں پوری لکھی جاتی ہے اور بیچ میں ہو تو ایک شوشے اور نقطوں سے ظاہر کی جاتی ہے۔ پس وٓ اور یٓ کی سب ملا کر تیرہ صورتیں ہوتی ہیں، جن کے لئے حسب ذیل حرفوں کا مقرر کرنا مناسب ہوگا:۔

حرفِ علّت

واو

مجہوٗل	و	: چور، شور، مور، ڈھول، چکور، لاءو، جاءو، پاو بھر آٹا، تاو، ناو۔
معرُوف	وٗ	: دوٗر، نوٗر، پھوٗل، جھوٗل، دھوٗل، جھاڑوٗ، کھاءوٗ، اُڑاءوٗ۔
ماقبل مفتوح	وْ	: جوْ، سوْ، نوْ، جوْر، طوْر، دھوْل دھپّا، کھوْلتا پانی
مخلوط اور معدوٗلہ	وٓ	: خوٓاب، خوٓاہر، درخوٓاست، خوٓاہش، خوٓاجہ، خوٓد، خوٓش، خوٓپشی۔

(تشریح۔ (۱) مجہول کے لئے کوئی نئی علامت مقرر نہیں کی گئی۔

(۲) معروف کے لئے اُلٹا پیش دیا گیا ہے جیسے مدظلّہٗ کی ہ پر عموماً دیا جاتا ہے۔

(۳) ماقبل مفتوح کے لئے سیدھا جزم اوپر لگایا گیا ہے

(۴) مخلوط یعنی جس واو کے بعد آ یا ی آئے اُس پر اُلٹا جزم لگایا گیا ہے۔

معدول واو کے لئے کسی اور نشان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ مخلوط اور معدول واو اِنے گنے فارسی لفظوں میں آتا ہے اور ان میں سے ہر لفظ خ سے شروع ہوتا ہے۔

فائدہ۔ الفِ ممدودہ یا یاے ممدودہ کے بعد اگر وٓ (مجہول) آئے تو اُس کی آواز پوری نہ رہے گی؛ جیسے تاو، پاو، ناو، گھاو، پڑاو (ایسی صورت میں ء کی ضرورت نہیں) اِسی طرح سیو، دیو وغیرہ۔ مگر جب لفظ کا ایک ٹکڑا الف ممدودہ پر یا یاے ممدودہ پر ختم ہو جائے تو ءٓ کا لکھنا ضروری ہے: جیسے آءو، جاءو، وغیرہ]

یاے | **آخر میں** | **بیچ میں**

	آخر میں	بیچ میں	
مجہول	ے	یـ	: کے، سے، بٹیر، سیر (وزن)، شیر، ہیر پھیر
معروف	ی	یِـ	: کی، پانی، پیر، تیر، شیر (دودھ) کھیر، بھیڑ (مجمع)۔
ماقبل مفتوح	یٰ	یۡـ	: ہیٰ، شیٰ، میٰ؛ شیخ، سیر، سیل، سیلاب
مخلوط		یٛـ	: پیاس، پیارا؛ تیوری، کیوں، جیوں تیوں

[تشریح (۱) مجہول کے لئے کوئی نئی علامت مقرر نہیں کی گئی۔

(۲) معروف کے لئے دونوں نقطوں کے بیچ میں نیچے کی طرف ایک شوشہ بڑھایا گیا ہے جیسے خوش نویس محض خوب صورتی کے لئے یے کے نقطوں کے نیچے لگاتے ہیں۔ پس کوئی نامانوس چیز نہیں ہے۔

(۳) ماقبل مفتوح اور مخلوط کے لئے سیدھا اور اُلٹا جزم اوپر لگایا گیا ہے۔

(۴) آخر میں یے کی تین صورتیں (ی ، ے اور ئ) استعمال ہی ہوتی ہیں اِن کی محض پابندی مقصود ہے۔ کوئی نئی تجویز اس امر میں پیش نہیں ہے۔

فائدہ۔ الفِ ممدودہ یا واوِ ممدودہ کے بعد اگر ے (مجہول) آئے تو اُس کی آواز پوری نہ رہے گی؛ جیسے چاے، راے، گاے، ناے، علماے کرام، آردوے معلّیٰ بوے گل (ایسی صورت میں ء کی ضرورت نہیں) مگر جب لفظ کا ایک ٹکڑا الف ممدودہ یا واوِ ممدودہ پر ختم ہوجائے تو ء کا لکھنا ضروری ہے جیسے آءے، جاءے، جائیے، کھوءے، کھوئیے وغیرہ]

حرفِ صحیح

واوِ صحیح : وٖ : کِوٖاڑ ، جوٖاب ، ثوٖاب ، وٖارث ، وٖہ ۔
یاے صحیح : یٖ : کیٖا ، دیٖا ، یٖاد ، یٖار ، خیٖال ، یٖہ
نون غنّہ : ں ، نٛ : کہاں ، یہاں ، ہنٛسنا ، پھنٛس گیا۔
ہاے ملفوظ : ہٖ ، ہہ : بیاہٖ ، پناہٖ ، چاہٖ ، راہٖ ، کُلاہٖ ، سیہہ بخت
" مخلوط : ھ : بھاو ، گھاو ، پھیر ، دھاوا ، کڑھائی
" مختفی : ہ ، ہ : پردہ ، زردہ ، بندہ ، مورچہ ، درجہ۔

{ یہ بھی وہی پُرانی باتیں ہیں۔ بس اِن پر عمل پابندی کے ساتھ ہو۔۔

عام طور پر تمام کتابوں کی اور اخباروں وغیرہ کی چھپائی میں اوپر کے گیارہ قاعدوں کی پابندی کی جائے تو کافی ہے۔

البتہ جو کتابیں مبتدیوں کے لئے ہوں یا جو لغت کے فن پر ہوں اُن میں اِن قاعدوں کی پابندی کے علاوہ جہاں جہاں ضرورت ہو زیر اور پیش کا نشان بھی لگایا جائے۔

واو اور یے کی مختلف آوازوں کے لئے الگ الگ حرفوں کے مقرر کرلینے کا ایک بڑا فائدہ

یہ ہے کہ اُن سے قبل جو حرف آئیں وہ اعراب سے مستغنی ہو جاتے ہیں؛ جیسے " وہ بھی کبھی جرأت کبھی سودا کبھی میر کے انداز میں غزل لکھتے تھے مگر آخر میں خواجہ میر درد کی طرز میں آ گئے تھے"۔ اِس عبارت میں "بھی" کا لفظ اس لئے اِعراب سے مستغنی ہوا کہ ی کی جو شکل لکھی گئی ہے وہ معروف ہے اور اُس سے پہلے کا حرف اُس کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا۔ یہی حال "کے"، "تھے"، "کی"، کا ہے۔ "کبھی" پر اعراب کی اِس لئے ضرورت نہیں کہ ک مفتوح ہے اور بھ کا حرفِ علت ی ہے جس کا معروف ہونا اُس کی شکل سے ظاہر ہے۔ "سودا" میں س کو و اور د کو ا اعراب سے مستغنی کرتا ہے۔ "میر" کے دونوں حرفِ صحیح اس لئے اعراب کو نہیں چاہتے کہ پہلے کے بعد حرفِ علّت مُشکّل ہے اور یہ دوسرا، لفظ کا اخیر حرف اور اس لئے ساکن اور جزم کے نشان سے مستغنی ہے۔ اب ذیل کی عبارتوں کو لو:-

۱- آؤ چلیں، شب بو کی بھینی خوشبو کو سونگھیں؛ تُم بھی سونگھو، مَیں بھی سونگھوں۔

۲- بے چارے غریب آدمی کے لئے جَو کی سوکھی روٹی پلاؤ زردے کا حُکم رکھتی ہے۔

۳- حمید نے تھوڑی سی سیر کی تھی اُس میں نَو سو سیر جَو پیدا ہوا، سارے گھر نے پورے سال بھر خوب پیٹ بھر کے کھایا اور بیس رُپئے کا غلّہ بیچ لیا سو الگ۔ جَو میں تو اِتنا فائِدہ ہوا مگر جوار جو اُس بچارے نے بوئی تھی ساری کی ساری پانی میں گل گئی کہ دوسری فصل میں بیج ڈالنے تک کو ایک دانہ مُیسّر نہ آیا۔

۴- وہ صُبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر
اور چاہوں کہ دِن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچّھا ذوق

(۱) تُم۔ (۲) پُلاؤ، حُکم (۳) رُپئے، لِیا، فائِدہ، بِچارے، مُیسّر (۴) صُبح، دِن۔ ۱۱ میں یہ دس لفظ ہیں جن میں صرف ایک ایک حرف اِعراب کے نشان کا محتاج رہا باقی تمام حروف اُن گیارہ قاعدوں کی پابندی سے کسی مزید اعراب کے محتاج نہیں رہے۔

بے اعراب کی

معمولی چھپی ہوئی عبارت

بھائی، جس دن تم کو خط بھیجا تیسرے دن ہردیو سنگھ کی عرضی اور پچّیس، روپے کی رسید اور پان سو کی ہنڈوی پہنچی۔ تم سمجھے بابو صاحب نے پچّیس روپے ہردیو سنگھ کو دیے اور مجھ سے مجرا نہ لیے۔ بہ ہر حال ہنڈوی بارہ دن کی میعادی تھی، چھے دن گزر گئے تھے، چھے دن باقی تھے۔ مجھ کو صبر کہاں؟ متّی کاٹ کر روپئے لے لئے، قرض متفرق سب ادا ہوا؛ بہت سبک دوش ہو گیا۔ آج میرے پاس معه نقد بکس میں اور چار بوتل شراب اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔ الحمدُ للہِ علیٰ احسانہٖ۔ بھائی صاحب آ گئے ہوں تو میر قاسم علی خاں کا خط ان کو دے دو اور میرا سلام کہو اور پھر مجھ کو لکھو تاکہ میں ان کو خط لکھوں بابو صاحب بھرت پور آ جائیں تو آپ کاہلی نہ کیجیے گا اور ان کے پاس جائیے گا کہ وہ تمھارے جویائے دیدار ہیں۔

غالب (اردوئے معلّیٰ)

اِعراب والی عبارت

مُبتدیوں کے پڑھنے کے لیے

بھائی، جِس دِن تُم کو خط بھیجا تیسرے دِن ہَردیو سِنگھ کی عَرضی اَور پچّیس روپئے کی رسید اَور پان سَو کی ہُنڈوی پہُنچی۔ تُم سمجھے بابو صاحب نے پچّیس روپئے ہَردیو سِنگھ کو دِیے اَور مُجھ سے مُجرا نہ لیے۔ بہ ہر حال ہُنڈوی بارہ دِن کی میعادی تھی، چھے دِن گُزر گئے تھے، چھے دِن باقی تھے۔ مُجھے صبر کہاں؟ مِتّی کاٹ کر روپئے لے لیے، قَرضِ مُتفرّق سب ادا ہُوا؛ بہت سُبک دوش ہو گیا۔ آج میرے پاس معه نقد بکس میں اَور چار بوتل شراب اَور تین شیشے گُلاب توشہ خانے میں مَوجود ہیں۔ الحمدُ لِلّٰہِ عَلیٰ اِحسانِہٖ۔ بھائی صاحب آ گئے ہوں تو میر قاسم علی خاں کا خط اُن کو دے دو اَور میرا سلام کہو اَور پھر مُجھ کو لِکھو تاکہ مَیں اُن کو خط لِکھوں۔ بابو صاحب بھرت پور آ جائیں تو آپ کاہِلی نہ کیجیے گا اَور اُن کے پاس جائیے گا کہ وہ تمھارے جُویائے دیدار ہیں۔

غالب (اُردوئے مُعلّیٰ)

بے اعراب کی عبارت	اعراب والی عبارت
ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے:	ہنوز اِک پَرتَوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے:
دلِ افسُردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا۔	دِلِ افسُردہ گویا حُجرہ ہے یوسُف کے زِنداں کا
(غالب)	(غالب)
محرم نہیں ہے تو ہی نواہاے راز کا	محرم نہیں ہے تو ہی نواہاے راز کا؛
یاں، ورنہ، جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا۔	یاں، ورنہ، جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
(غالب)	(غالب)
منہہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا	مُنہہ تکا ہی کرے ہے جِس تِس کا؛
حیرتی ہے یہ آئنہ کس کا؟	حیرتی ہے یہ آئینہ کِس کا؟
(میر)	(میر)
عشق برے ہی خیال پڑا ہے، چین گیا، آرام گیا؛	عِشق بُرے ہی خیال پڑا ہے، چین گیا، آرام گیا
جی کا جانا ٹھیر گیا ہے: صبح گیا یا شام گیا۔	جی کا جانا ٹھیر گیا ہے: صُبح گیا یا شام گیا۔
(میر)	(میر)

اوپر کی عبارت دو طرح پر لکھی گئی ہے: پورے اعراب کے ساتھ بھی اور ادھورے اعراب کے ساتھ بھی اُس سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ جو قاعدے کتابت کے بیان ہو چکے ہیں اُن پر عمل کیا جائے تو بہت تھوڑے نشان لگانے سے عبارت کی تشکیل ہو جاتی ہے یعنی تلبیس نہیں رہتی اور چوں کہ اعراب بہت گھٹ گئے ہیں اور واو، یے وغیرہ حرفوں کی مختلف آوازوں میں سے ہر ایک نے ایک مستقل حرف کی صورت اختیار کر کے اپنے ماقبل حرف کو اعراب سے مستغنی کر دیا ہے اور پھر امکان بھر ایک ایک لفظ الگ لکھا گیا ہے اس لئے لوہے کے چھاپے میں بھی کما حقہ آسانی ہو گی۔

آخر میں مجھے اتنا عرض کرنا ہے کہ بعض لفظ ضرور ایسے ہیں جن کو ہم مجوّزہ قاعدوں کے مطابق نہیں لکھ سکتے۔ جیسے "ہونا" کا ماضی مطلق "ہؤا"، "ہوئی" اگر ان دونوں لفظوں کو قاعدے کے

مطابق لکھئے تو یوں ہوں گے؛ "ہُنا"، "ہُئی" یہ مروّج شکل سے بہت دُور پڑجاتے ہیں اور سچ پوچھو تو صوت کے لحاظ سے بھی کچھ زیادہ ٹھیک نہیں۔ پس اس خاص صورت میں کہ ہم کو ایک ایسی آواز کو کتابت میں لانا ہے جو ہٖ اور ءٖ کے بین بین ہے، بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتابت یوں کی جائے: "ہُوءا"، "ہُوءی"

اِسی طرح بعضے لفظوں میں "وٗ" لکھا جائے مگر اُس کی آواز خفیف ہو گی جیسے "کان پوٗر" اِس کا فصیح تلفظ "کان پُر" ہے پس ایسی صورتوں میں بہتر یہی ہے کہ لفظ کی اصل کا لحاظ کر کے اُس کی کتابت کی جائے یعنی "کان پوٗر"، "شاہ جہاں پوٗر" گو کہ اُس کا تلفظ "۔۔۔ پُر" کیا جائے۔

نستعلیق ٹھپّے کے بنانے میں جو دقّتیں ہیں اُن کا جو حل میرے ذہن میں ہے اُسے میں کسی دوسرے موقعے پر بیان کروں گا۔

کلامِ وہّاج

(جناب وہّاج الدین حید رصاحب وہّاج جو آج کل ریاست بھوپال میں ایک منصب جلیلہ پر مامور ہیں
اُردو کے بڑے قادر الکلام شاعر ہیں۔ حضرت وہّاج کو زمانۂ طالب علمی سے شعر وشاعری کا لپکا ہے اور
حقیقت یہ ہے کہ خوب کہتے ہیں۔ اُن کے کلام میں صفائی، شیرینی اور گھلاوٹ پائی جاتی ہے۔ آپ نے
ایک خط اپنے دوست مولوی محمد حسین صاحب محوی کو لکھا ہے جس میں اپنی چند مختصر نظمیں بھی درج
فرمادی ہیں۔ یہ نظمیں بہت قابل قدر ہیں اور یقین ہے کہ ناظرین لطف حاصل کریں گے۔ اڈیٹر)

... نسیم باغ کا آنا اور گل وسنبل سے اٹھکیلیاں کرنا، قاآنی نے اپنا حصہ کرلیا ہے میں نے آپ کی اُردو
میں اُسی نمونہ کے مطابق، جس کا ذکر آپ سے کیا تھا۔ جو کچھ لکھا ہے وہ حسب فرمائش لکھتا ہوں۔ مولانا عبدالحق صاحب
کو بھی سنایئے گا۔ اس نمونہ کے متعلق جو نوٹ لکھا تھا وہ بھی منقول ہے۔

نوٹ: اکثر کہا جاتا ہے کہ جو موقع اظہار جذبات کا اور اُن کے اثرات کا بہاشا میں ہے، وہ اُردو
میں بھی فارسی کی طرح نہیں ہوتا۔

اقتباس نامۂ وہاج — یہ بحث کہ فارسی اور اُردو نیز عربی بلکہ دیگر مشرقی ومغربی زبانوں کی شاعری میں یہ موقع
اور اثر کس قدر ہے، طویل اور محتاج تفصیل ہے۔ اُردو زبان کے متعلق صرف یہ تسلیم کرنا لازمی ہے کہ فارسی کی
طرح کی اس میں بھی عورتوں کی طرف سے خطاب نہیں کیا جاتا اور جو اثر بلحاظ نزاکت بیان و انداز تقریر عورتوں
کی زبان میں ہے۔ اُس کا مقابلہ مَردوں کی زبان اور طرزِ بیان سے نہیں ہوسکتا۔ مگر غور کرنے سے ظاہر یا محسوس
ہوتا ہے کہ جس طرح نثر اُردو میں عورتوں کی زبان میں بالفاظ اُردو اظہارِ جذبات اور خیالات کا اندازہ کامیابی کے
ساتھ ہو چکا ہے۔ نظم میں بھی ممکن العمل ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس صنف نظم پر مثل دیگر اصناف کے ہنوز توجہ نہیں
کی گئی ہے۔ (ریختی کی افسوس ناک مثال خارج از بحث ہے) بالفعل میں اسی خیال کی تمثیل میں بغیر دعوۂ تکمیل

چند نمونے پیش کرتا ہوں۔ جن میں گو عورتوں کی طرف سے بہ تمام و کمال التزام نہیں ہے۔ نہ یہ اُردو میں بہ حالت موجودہ مستحسن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بعض لوازم موجود ہیں۔ مثلاً حتی الامکان اُردو اور بھاشا کے الفاظ جو اُردو میں جوازاً مستعمل ہیں۔ اُن کی تلاش کی جائے اور فارسی، عربی وغیرہ کے الفاظ نیز ترکیبات اضافی سے اجتناب کیا جائے۔ یہ غزل تو آپ سن ہی چکے ہیں۔ جس کے دو شعر لکھتا ہوں :

کیسی ادا سے آ بیٹھی دل میں ۔۔۔ لے لوں بلائیں میں پیاری نظر کی
طور کو پھونکا جس کی لپک نے ۔۔۔ تھی وہ تجلی تمھاری نظر کی

صبح بہار بھی آپ سن چکے ہیں۔ اس کے بھی چند شعر لکھے جاتے ہیں :

کیا صبح ہے سہانی ۔۔۔ پہنے ہے جوڑا دھانی
سبزے میں کیا لہک ہے ۔۔۔ پھولوں میں کیا مہک ہے
دُلھن بنی ہر کیاری ۔۔۔ جوبن پہ ہے پھلواری
پیڑوں نے زیور پہنا ۔۔۔ بھاری ہے کیا کیا گہنا
سنبل نے گیسو کھولے ۔۔۔ شبنم نے موتی رولے
کلیاں چٹک رہی ہیں ۔۔۔ چڑیاں چہک رہی ہیں
کیا گل ہے کیا گل کاری ۔۔۔ کیا شان ہے میں واری
بیلا، چنبیلی، جوہی ۔۔۔ ہر پھول میں ہے تو ہی
گل پر فدا ہے بلبل ۔۔۔ تجھ پر ہے صدقے ہر گل

. . . .

قاآنی کا فارسی بند حسب ذیل ہے :-

نرمک نرمک نسیم، زیرِ گلاں می خزد ۔۔۔ غلغب ایں می کند، عارضِ آں می مزد
سنبل ایں می کشد، گردنِ آں می گزد ۔۔۔ گہ بچمن می چمد، گہ بسمن می وزد
گاہ بشاخِ درخت، گہ بلبِ جوئبار

اُردو میں اس طرح تصویر کھینچی گئی ہے :

(۱)

دھیمی دھیمی نسیم، سبزہ پہ سوتی ہوئی — سو کے اُٹھی ہی تو مُنہ، اوس سے دھوتی ہوئی
نہروں پہ لہرا گئی، لہروں سے ٹکرا گئی — کیاریوں پر چھا گئی، پیڑوں پہ منڈلا گئی

(۲)

سرو نے لپٹا لیا، کٹ گئی شرما گئی — مُڑ گئی کترا گئی، کپ گئی تھرّا گئی
رُک گئی، گھبرا گئی، جُھک گئی دُہرا گئی — اُس کو بھی بل دے دیا آپ بھی بل کھا گئی

(۳)

ہلکی ہلکی نسیم، شاخوں میں بہتی ہوئی — کلیوں سے ہنستی ہوئی، پھولوں میں بستی ہوئی
چوس لیئے اِن کے ہونٹ، چوم لیا اُن کا مُنہ — کلیوں سے اِٹھلا گئی، پھولوں سے اِترا گئی

(۴)

بھینی بھینی نسیم! تو نے کھلائی بہار — جھوم کے مستوں کی طرح دھوم سے آئی بہار
باغ سے فردوس کے، بَن کے دُلھن آ گئی — چھوڑ کے پردیس کو اپنے وطن آ گئی

(تاج الدین حیدر (بھوپال)

بیرسٹر ایٹ لا

اصلاحِ اُردو

(جناب سید الطاف حسین صاحب کاظم)

ماہ اپریل کے رسالۂ اُردو جلد سوم حصّہ دہم میں دو اور مضامین اصلاح رسم خط کے متعلق دیکھے گئے۔ جن میں متعدد و مختلف مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ علت غائی ان تمام مضامین کی یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ اُردو رسم خط رومن کیرکٹر یا دیوناگری کے برابر سہل ہو جائے، لیکن اس مدعا کے لئے ہماری بحثیں نسبتاً زیادہ باقاعدہ ہونی چاہئیں یعنی اول ان تمام تغیرات کو قلمبند کر لیا جائے جن سے ہم مطلوبہ نتیجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر بدفعات ایک ایک بات پر بحث کی جائے ہر بحث میں فریقین کو یہ اصول پیش نظر رکھنا لازم ہوگا کہ اگر ہم گزشتہ دور کی تحقیقات کو یک قلم باطل سمجھ لیں تو یہاں تک نہیں پہنچ سکتے اور سب کو آنکھ بند کر کے صحیح تسلیم کر لیں تو آگے نہیں بڑھ سکتے۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اول اردو کتابت کو صحّت و سہولت میں دیوناگری کی برابر بنایا جائے اس کے بعد برتری کی کوشش کی جائے اس لئے اوقاف و اعجام کی بحث ابھی قبل از وقت ہے۔

اصلاح رسم خط میں اہم بات یہ ہے کہ متحد الصوت حروف بھی خارج کر دیئے جائیں اور لکھنے میں محض تلفظ کی ہی پابندی کی جائے تو بھی اُردو حروف تہجّی کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ رومن کیرکٹر کی برابر اُس وقت بھی سہولت پیدا نہ ہوگی۔ کیونکہ ایک عین عَہد میں اور شکل کا ہے بُعد میں اور وضع کا اور نزاع میں اور صورت کا وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ دیوناگری کو اس شترگربگی کی ہوا بھی نہیں لگی۔

لہذا

ان چند در چند خیالات کی بنا پر جو جو مسائل بظاہر قابل غور معلوم ہوتے ہیں ایک جگہ لکھ کر ہم اپنے خیالات مختصراً

لہ یہ مضمون مجلس کے فیصلے کے بعد وصول ہوا۔ چونکہ اس میں بعض اور امور پر بھی بحث ہے لہذا درج کیا جاتا ہے (اڈیٹر)

پیش کئے دیتے ہیں، اختلافی دلائل کے جواب میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔ اختلاف کی صورت میں ایک ہی مسئلہ زیر بحث آنا چاہیئے، اور جن جن شقوں سے اتفاق ہو وہ سب ایک دفعہ ہی لکھ دیئے جائیں تاکہ مباحث جلد کسی منفی یا مثبت نتیجے پر پہنچ جائیں۔

۱۔ حروف تہجی کی ترمیم

(۱) حروف ثقیلہ اور حروف غنہ بڑھائے جائیں۔

(۲) حروف متحد الصوت خارج کر دیئے جائیں۔

(۳) دو یاء میں سے ایک رکھی جائے۔

(۴) ژ کو بھی خارج کیا جائے۔

(۵) اقسام و خواص۔

۲۔ رسم خط کی اصلاح

(۱) اقسام واو

(۲) اقسام یاء

(۳) مرکبات

۳۔ تلفظ کی پابندی

(۱) حروفِ مغیرہ کا اثر۔

(۲) تنوین۔

(۳) آل اضافی۔

(۴) عیسیٰ موسیٰ وغیرہ الفاظ

(۵) گنبد۔ دُنبہ " "

(۶) واوِ معدولہ

۴۔ بعض حروف کی رسم خط

(۱) حروف تہجّی ہر زبان کے جزء لایتجزیٰ۔ عنصر یا مفرد آوازیں ہیں۔ ہر مفرد آواز کے لئے ایک شکل یا نشان مقرر کر کے اُس کا نام رکھ لیا گیا ہے، اس لئے حروف تہجی میں ایک آواز کے لئے دو شکلیں یا دو آوازوں کے لئے ایک شکل ہو تو نقص میں داخل ہے۔ یا سرے سے بعض آوازیں ہی نہوں تو وہ حروف تہجّی مکمل نہیں۔ یہ ایک سادہ عقلی اصول ہے۔

۱۔ اُردو حروف تہجّی کو دیکھئے تو وہ کسی طرح اس معیار پر کھرے نہیں اُترتے اس میں ز، ذ، ض، ظ وغیرہ ایک آواز کی چند شکلیں بھی موجود ہیں اور بہت سی آوازوں کی شکلیں موجود بھی نہیں تھیں۔ چنانچہ کل کی بات ہے۔ ایک آواز کے لئے دو نشان ملا کر کام نکالا جاتا تھا اور کھا کے ہجے ک ہ ا زبر کھا کئے جاتے تھے۔ جو کسی طرح صحیح نہیں سمجھے جا سکتے۔ اس دقّت کو پنجاب یونیورسٹی نے حروف تہجّی میں حروف ثقیلہ بڑھا کر رفع کر دیا اور تعصب کو چھوڑ کر ٹھنڈے دل کے ساتھ غور کیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ بہت اچھا کیا اور اُردو پر احسان کیا۔ لیکن جس قدر ثقیل آوازیں تھیں اول تو وہ بھی پوری نہیں بڑھائی تھیں۔ دوسرے اُن سے زیادہ غنغنی آوازیں سب کی سب باقی رہ گئی تھیں جو کثرت سے ہمارے روزمرہ میں آتی ہیں چنانچہ جس طرح کھیل، کھلونا کے صحیح ہجے بغیر حروف ثقیلہ کے نہیں ہو سکتے اسی طرح ہنسلی اور [illegible] کے بغیر حروف غنہ کے ممکن نہیں ہیں اس لئے ہم نے اپنے جدید قاعدہ اُردو میں حروف غنہ بڑھا دیئے ہیں اور حق یہ ہے کہ اس کے لئے کسی دقیق فلسفیانہ کاوش کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ایک ضمنی مگر اہم فائدہ ان سے یہ پہنچتا ہے کہ ترکیب الفاظ میں حروف کی جو شکلیں بدل جاتی ہیں اُن سے بچّہ حروف تہجّی میں ہی واقف ہو جاتا ہے۔ اور بہت جلد چل نکلتا ہے۔ المختصر ہمارے نزدیک جب تک حروف غنہ نہ بڑھائے جائیں گے اُردو حروف تہجی کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

۲۔ متحد الصوت حروف کا اخراج بظاہر ایک بڑا معاملہ معلوم ہوتا ہے مگر جب کہ ان اشکال و حروف پر نہ اسلام کا دار و مدار ہے نہ مسلمانوں کی قومیت کا انحصار۔ تو یہ چنداں پس و پیش کا معاملہ معلوم نہیں ہوتا خصوصاً ایسی صورت میں کہ ایک یقینی و نقد فائدہ بھی نظر آتا ہے ان حرفوں کا سب سے بڑا فائدہ موجودہ حالت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر لفظ اپنا شجرۂ نسب ساتھ رکھتا ہے اور فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کا مادّہ کیا ہے اور

کس لفظ سے مشتق ہوا ہے۔ جس سے ہم اس لفظ کی املا میں غلطی نہیں کرتے لیکن جب تمام متحد الصوت حروف خارج ہو کر سب کی جگہ صرف ایک ہی حرف رہ جائے گا تو غلطی کا امکان و احتمال ہی نہ رہے گا لہذا یہ فائدہ محض کوہ کندن و کاہ برآوردن ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح اب عبد العظیم کے معنی سمجھ میں آتے ہیں اس طرح ابدل ازیم کے معنی سمجھ میں نہ آسکیں گے مگر یہ بھی کچھ بات نہیں ہے۔ روٹی، ٹکڑا، کاغذ، دوات، سفید سُرخ وغیرہ صدہا الفاظ کے معنی سمجھ میں نہیں آتے اُس وقت ناموں کے معنی سمجھنے کی کیا ضرورت پیش آئیگی اب بھی ہزاروں لفظ ہیں جن کی شکل اُردو لباس میں نہیں پہچانی جاتی اور دوسری زبان کے لغت سے پتا لگایا جاتا ہے۔ اُس وقت بھی عربی لغت سے وقت ضرورت ایسے الفاظ کے معنی سمجھ لیا کریں گے۔

۳۔ جب متعدد حروف اس لئے نکالے جاتے ہیں کہ وہ متحد الصوت ہیں، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک ہی حرف بجنسہ دو جگہ رکھا جائے۔ لہذا ایک ے بھی خارج ہونے کے لائق ہے۔ جس طرح ایک واو تین صورتوں میں کام دے سکتا ہے۔ ایک ی بھی دے سکتی ہے۔ اس میں تعمیم کا زرّیں اصول بھی نہیں ٹوٹتا۔

۴۔ علیٰ ہذا جب متحد الصوت حروف باوجود اس کے کہ ان کے الفاظ ہمارے روزمرہ میں موجود ہیں نکالے جانے ضروری قرار دیئے جائیں۔ تو ژ جس کا کوئی لفظ ہمارے روزمرہ میں نام کو نہیں آتا کیا وجہ ہے کہ حروف تہجّی میں داخل رکھا جائے۔

۵۔ اس تمام اضافہ و اخراج کے بعد حروف تہجّی کی تین قسمیں ہوگئیں۔

ا — حروف قدیمہ = ۲۶

اب پ ت ٹ ج چ خ د ڈ ر ز س ش غ ف ق ک گ ل م ن
و ہ ء ی

ب — حروف ثقیلہ = ۱۴

بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ دھ ڈھ ڑھ کھ گھ لھ مھ نھ

ج — حروف غنّہ = ۱۲

اںّ بھںّ پںّ جںّ ڈںّ کںّ مںّ ہںّ پھںّ چھںّ دھںّ گھںّ

حروف قدیمہ بھی کئی قسموں میں منقسم ہو سکتے ہیں مثلاً :

ا - حروف علت آ وَ یَ

ب - " ناقصہ ڑ ء ںَ جن سے کوئی لفظ کبھی شروع نہیں ہوتا۔

ج - " منفصل جو لفظ کے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور ملا کر نہیں لکھے جاتے مثلاً آ ر د و ز ڈ ڑ

د - " متصل مثلاً ج ب ن وغیرہ جو اول و آخر لفظ کے ہر حصے میں ملا کر لکھے جاتے ہیں

ہ - یہ کلیہ ہے کہ حروف غُنہ ساکن یا موقوف صورت میں کبھی نہیں آتے ہمیشہ صرف متحرک ہوتے ہیں۔

(۲) رسم خط -

۱- واو تین طرح کی ہوتی ہے۔ واو مجہول، جس کے ماقبل حرف پر غیر جنس حرکت ہو۔ جیسے لَو کے لام پر زبر۔ دوسری واو معروف جس کے ماقبل پر حرکتِ ہم جنس یا پیش ہو۔ جیسے لُو۔ تیسری واو متوسط جس پر کوئی حرکت نہ ہو ہم جنس نہ غیر جنس - اس کی آواز دونوں واووں کے بین بین ہوتی ہے جیسے لو

۲- واو کی طرح یار کی بھی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ حرکت ہم جنس اور غیر جنس کے لحاظ سے آوازیں تبدیل ہوتی ہیں۔ یہ امر تقریباً طے شدہ ہے کہ واو اور یار متوسط کے ماقبل پر کوئی حرکت ہم جنس یا غیر جنس نہیں ہوتی۔

۳- واؔو اور یاؔر کے علاوہ مرکب الفاظ میں مولوی سید ہاشمی صاحب کی رائے کے بموجب جو اجزار لفظ ترمیم ہو کر مستقل لفظ نہیں رہے وہ ملا کر لکھنے چاہئیں۔ اور جو اجزار اصلی حالت میں بامعنی لفظ ہیں اُن کو جدا جدا لکھنا مناسب ہے جیسے پنگھٹ اور کام چور

(۳) تلفظ کی پابندی

۱- حروف معزرہ کا اثر: اس میں پروفیسر نعیم الرحمٰن صاحب کی رائے قابل تسلیم ہے۔ کہ جن الفاظ کے آخر میں ہار مختفی سے پہلے ع ہو تو ہار مختفی کو یار سے بدل دینا چاہیئے۔ مگر جب ع حروف تہجی سے خارج ہو جائے گا، تو الف یار سے بدلا جائے گا۔

۲- تنوین کی جگہ بھی نوُن لکھا جانا مناسب ہے۔ چنانچہ فوراً سے فورن لکھا جائے گا۔

۳ - آل اضافی کو اُڑا کر تلفظ کی پابندی سے صرف لام ساکن لکھا جائے اور اس کا ماقبل مضموم ہو۔ جیسے عبدُلکریم -

۴ - عیسیٰ - موسیٰ الفاظ میں یا کی جگہ الف لکھا جائے گا -

۵ - گُنبد، دُنبہ میں صاف میم ہی لکھا جائے -

۶ - واو معدولہ کو معدوم کر دیا جائے اور سیدھے طور سے خاب، کمخاب ، خُراک لکھنا مناسب ہوگا -

———×٠×٠×———

تبصرے

ادب

دیوانِ غالب ۱۔ علی گڑھ کے مکتبۂ جامعۂ ملّیۂ اسلامیہ نے غالب کے اُردو کلام کو نہایت آب و تاب سے شائع کرکے اُردو بولنے والی قوم پر ایک بڑا احسان کیا ہے ایسی اچھی چھپائی اور اتنی خوبصورت جلد میں کسی اُردو شاعر کا دیوان اب تک نظر سے نہیں گزرا تھا۔ کتاب شہر برلین (جرمانیہ) کے مشہور ایرانی چھاپے خانے "مطبع کاویانی" میں دو رنگوں میں چھاپی گئی ہے۔ سیاہ متن کے گرد سرخ جدول بہت بھلی معلوم ہوتی ہے شاعر کا تخلص جا بجا سُرخ حرفوں میں نمایاں ہے تقطیع جیبی ہے اس لئے ہر صفحہ پر زیادہ سے زیادہ چودہ مصرعے آئے ہیں۔ کتاب کی لوح کے مقابل غالب کی رنگین تصویر لگی ہے جو جرمانی رنگ آمیزی اور چھپائی کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ کتاب کی جلد کپڑے کی ہی جس پر سنہرا کام اور اُس کے بیچ میں سیاہ نستعلیق حرفوں میں کتاب کا نام بہت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ پشتے پر اوپر کی جانب ایک سیاہ چھٹی پر ہین سنہرے نستعلیق خط میں کتاب کا نام بڑے سلیقہ سے چھاپا گیا ہے۔

۲۔ چونکہ کتاب نسخ ٹھپے کے حرفوں میں چھپی ہے اس لئے لمبی تے کہیں نہیں دکھائی دیتی مگر معروف ی کے نیچے دو نقطے لگا کر اسے ممتاز کر دیا ہی اور ٹ ڈ ڑ پر بجائے ط کے چار نقطے سلیقے سے لگائے ہیں جو ہرگز بُرے معلوم نہیں ہوتے۔

۳۔ الغرض غالب کا یہ نسخہ ظاہری خوبیوں میں اپنا جواب نہیں رکھتا ہے اس لحاظ سے قیمت بھی بہت کم ہے یعنی صرف (سے۔)

۴۔ افسوس صرف اس قدر ہے کہ صحت کا کافی انتظام نہیں کیا گیا۔ بعض جگہ کوئی حرف چھپنے سے رہ گیا ہے

مثلاً ص ۱۳ س ۲ (نیچے سے)، ص ۱۳ س اخیر ص ۴۷ س ۳، ص ۶۸ س ۱، (نیچے سے)، ص ۱۹۷ س ۹
ص ۲۰۱ س ۴ (نیچے سے) ص ۲۴۸ س ۵ (نیچے سے)، ص ۲۷۲ س ۵ (نیچے سے) کہیں کوئی پورا لفظ غایب ہے
جیسے ص ۲۳۲ س ۶ کے شروع اور ص ۲۶۹ س ۱۱ کے آخر سے "غالب"۔

۵۔ چند اور غلطیاں بھی نظر پڑیں جن کی تصحیح یہاں کی جاتی ہے :۔ ص ۹ س ۷ "سوئے ہیں" کی جگہ
"سوتے ہیں" چاہیئے۔ ص ۱۳ س ۴ "نہ" کے بجائے "نہ" چاہیئے۔ ص ۱۱۵ "کسی کی خواب" کی جگہ "کسی کے
خواب" چاہیئے ص ۱۱۹ س ۱۱ "ہو" کی جگہہ "کہ" چاہیئے اور پورا مصرعہ یوں لکھا جائے: بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ،
مجھ کو قرار ص ۱۲۱ س ۵ (نیچے سے) "ہوا" کی جگہہ "ہو" چاہیئے ص ۱۲۸ س ۱۰ "ٹھنٹا" کی جگہہ "ٹھنڈا" چاہیئے
ص ۱۸۷ س ۷ "سمجھ کہ" کی جگہہ "سمجھ کے" ہونا چاہیئے۔ ص ۲۰۷ س ۷ "غالب" مصرعے میں سماتا نہیں
"اسد" چاہیئے ص ۲۳۷ س ۹ "تیر اگزر" کی جگہہ "تیرا گزر" چاہیئے۔ ص ۲۶۶ "اب کے سال" اور "اب کے
بار" چاہیئے۔ ص ۲۷۲ س ۴ "فشردن" کی جگہہ "فسردن" چاہیئے۔

۶۔ کہیں کہیں وقف کے نشان لگائے گئے ہیں لیکن اس میں بھی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔
جہاں ضرورت تھی وہاں اکثر نشان نہیں لگائے گئے اور بعض جگہہ غلط نشان لگے ہیں۔ مثال کے طور
پر چند مقامات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ص ۳۸ س ۷ "لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں، لگاؤ" ص ۱۱۸ س ۱۰ "کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو، تو کیوں کر
ہو" ص ۱۲۸ س ۴ "جس میں کہ ایک بیضۂ، مور آسمان ہے" ص ۱۴۶ س ۷ "اور اگر ہو بھی ؟" ص ۱۶۵ س ۲
"دل بھی یارب، کئی دئے ہوتے" ص ۱۶۶ س ۲ "داعی ؟"

پہلی مثال میں سکتے کا نشان "سمجھیں" کے بعد نہیں بلکہ "لاگ ہو" کے بعد اور دوسری مثال میں "نہ ہوا"
کے بعد ہونا چاہیئے تھا۔ تیسری میں سکتے کا اور چوتھی میں استفہام کا نشان ہونا ہی نہ چاہیئے تھا۔ پانچویں
اور چھٹی مثال میں استفہام کے نشان کی جگہہ خطاب کا نشان (!) چاہیئے تھا۔ ذیل میں بعض مثالیں درج کی
جاتی ہیں اگر ان میں ایک آدھ جگہہ وقف کے نشان ہوتے تو متن کے پڑھنے والے کو بڑی آسانی ہو جاتی۔
جو نشان قوسین کے اندر نظر آتے ہیں وہ میری تجویز ہے۔

ص ۶۴ س ۵ "جو ہوا غرقۂ مے [،] بخت رسا رکھتا ہے" ص ۱۰۱ س ۲ (نیچے سے) سب [،] رقیبوں سے ہوں ناخوش [؛] پر زنانِ مصر سے ٭ ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں"۔

ص ۱۱۹ پر پہلے اور پانچویں شعر کے علاوہ بھی ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں "تو کیوں کر ہو" سے پہلے سکتے کا نشان ہوتا تو بہتر تھا۔

ص ۱۴۵ س ۲ (نیچے سے) "کروں بے دادِ ذوقِ پرفشانی عرض [،] کیا قدرت؟ ص ۲۰۸ س ۷ - "تکلف برطرف [،] ہے جاں ستاں تر لطفِ بدخویاں" ص ۲۳۵ س ۷ "کون ہے [،] جس کے در پہ ناصیہ سا ص ۲۵۸ س ۹ " تار ریشم کا نہیں [،] ہے یہ رگ ابرِ بہار"!

۷۔ الف پر زیر یا پیش کہیں نہیں لگایا گیا جس سے "اِس" اور "اُس" میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ ہمزہ کی کتابت بالکل بے اصول ہے "سخت جانی ہائے"۔ "جوئے شیر"، "بروئے کار"، "نسخہ ہائے وفا"، "دریائے خوں"، "حنائے پائے خزاں" وغیرہ میں ہمزہ نہ لکھنا چاہیئے۔ اسی طرح "بوئے گل" کی جگہ "بوئی گل" اور "پائے ثبات" کی جگہ "پائی ثبات" اور ص ۱۲۸ پر اخیر سطر میں "فرماں روائے" کی جگہ "فرماں روائی" لکھا گیا ہے جو بالکل غلط ہے یاد رہے کہ کسرۂ اضافت کا بدل ہمزہ بھی ہے اور یؔ بھی پس ایک اضافت کے لئے ہمزہ اور یؔ دونوں لکھنا درست نہیں ہو سکتا۔ مختفی ہؔ پر ختم ہونے والے لفظوں کے بعد ہمزہ سے اور آیا وؔ پر ختم ہونے والے لفظوں کے بعد یؔ سے اضافت کو ظاہر کرنا چاہیئے۔ بے شک عام طور پر اضافت کی کتابت میں بڑی بدنظمی پھیلی ہوئی ہے مگر دیوانِ غالب کے زیر تبصرہ نسخے کے ترتیب دینے والوں کو اس بدنظمی میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور بھی جگہ ہمزہ بے محل لکھا گیا ہے مثلاً ص ۱۸ س ۷ "دیدۂ و دل" (یعنی "دیدہ و دل") ص ۱۸ س ۱ "دیئے" (یعنی "دے") ص ۹۵ س ۹ "فتنۂ و فساد" (یعنی "فتنہ و فساد")۔

۸۔ ایک دوسری بدنظمی اردو کی کتابت میں یہ بہت عام ہے کہ جس جگہ پرؔ ے بولتے وہاں بھی ہؔ لکھتے ہیں جیسے "بندہ نے کہا"۔ "پردہ کے پیچھے" وغیرہ۔ غالب کے اس نئے نسخے میں عموماً ایسا نہیں کیا گیا ہے۔ مگر کہیں کہیں غلط رسم خط اختیار کر لیا ہے۔ چنانچہ ص ۱۱ س ۳ (نیچے سے) "بت کدہ کا در" ص ۳۶ س ۲ "ریختہ کے" ص ۱۱۳ "بت خانہ میں" ص ۱۹۳ س ۷ "شعلہ میں" ص ۲۰۶ س ۵ "کعبہ سے" اور س ۷ "مے خانہ کا" حال آں کہ ہونا چاہیئے تھا: "بت کدے کا در"، "ریختے کے"، "بت خانے میں"، "شعلے میں"، "کعبے سے"، "مے خانے کا" ص ۱۰۵ س

شعر میں "آئینہ" کے بجائے "آئینے" لکھنا نہایت ضروری ہی: ہوئے اُس مہروش کے جلوۂ تمثال کے آگے۔
پرافشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرّہ روزن میں۔

۹۔ لفظوں کو الگ لکھنے کی کوشش کی گئی ہی، لیکن بعض جگہہ نہایت بے پروائی کے ساتھ دو ایسے لفظوں کو ملا کر لکھ دیا ہے جن کا ملانا غلط ہی جیسے "اسقدر"، "رضوانکا"، "رضوانسے"، "نسیانکا"، "شمنتانکا" "خستہ جانکی" اسی طرح بعض جگہوں پر دو لفظوں یا ایک ہی لفظ کے ٹکڑوں میں غلط فاصلہ دے دیا ہی جس سے پڑھنے والے کو اکثر دھوکا ہوتا ہے" جیسے "مشکل پسند آیا" کی جگہہ "مشکل پسند آیا" لکھ دیا ہے۔ یا ص ۲۳۶ س اخیر "گودرز" لکھنے کے عوض "گو درز" لکھا ہے۔

یہ نہیں معلوم ہوتا کہ "رہیو" "کہیو" وغیرہ کی ی پر تشدید کس قاعدے سے لگائی گئی۔ شاید یہ غلطی بدایوں کے چھپے ہوئے نسخے سے اخذ کی گئی ہی۔

۱۱۔ "تماشا" کا املا عموماً صحیح لکھا گیا ہے لیکن دو ایک جگہہ غلط املا "تماشہ" بھی نظر پڑا (ص ۸، ۲۲) یاد رکھنے کی بات ہی کہ عربی لفظوں میں تماشا، تقاضا وغیرہ اور فارسی ترکی لفظوں میں تمغا، چلیپا، ناشتا وغیرہ الف سی صحیح اور ہ سے غلط ہیں۔ بعضے حضرات تو ستم کرتے ہیں کہ "استعفا" کو "استعفیٰ" لکھتے اور اسی کو عربی صرف کے مطابق سمجھتے ہیں یہ نہیں جانتے کہ عربی میں "اِستعفاء" (استفعال کے وزن پر) ہی۔ اور "طالب" کی جمع یاروں نے "طُلَبا" بنا رکھی ہی حالاں کہ عربی میں "طلبہ" ہے۔

۱۲۔ ص ۱۶۲ س "بارِبد" کی دوسری ب پر خاص اہتمام سے پیش لگایا گیا ہی۔ لیکن یہ درست نہیں بلکہ صحیح تلفظ "بارَبد" ہی فارسی میں کئی لفظ ایسے ہیں جن پر لاحقہ بد (بمعنی صاحب) داخل ہوا ہی جیسے موبد، سپہبد، باربد قدیم فارسی زبان میں یہ لفظ پت تھا (سنسکرت پَتِ)

۱۳۔ غالب کے دیوان کے قابلِ اطمینان نسخوں کے متن سے اس متن میں بعض ایسے اختلافات نظر پڑے جن پر مجھے نہایت تعجب ہوا اور جن کا حل سوا اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ شاعر کو اصلاح دینے کی کوشش کی گئی ہی۔ مگر یہ بات تصحیح کے اصول کے بالکل خلاف ہی۔ مصحح کو متن میں تغیر تبدل کرنے کا ہرگز اختیار نہیں ہی البتہ اگر مختلف نسخوں کی قرارت مختلف ہو تو وہ ایک کو ترجیح دے سکتا ہی یا اگر سب قراتیں ایسی ہوں کہ معنی بنتے ہی نہ ہوں تو اپنے قیاس سی ایک نیا لفظ

متن میں داخل کرے لیکن اس کی اطلاع ضرور کردے افسوس ہے کہ غیر محتاط مصحح یا شارح اس اصول کی پرواہ نہیں کرتے چنانچہ مولوی ابوالحسن صاحب بدایونی نے حافظ کے کلام میں سینکڑوں تصرف کئے ہیں فرماتے ہیں کہ:۔

"دگر کنم طمع نیم بوسہ صد افسوس
زحقۂ دہنش چوں شکر فرو ریزد

میں "افسوس" سہو کاتب ہے "دشنام" ہونا چاہیئے" لیکن اگر وہ کسی فارسی لغت کی کتاب کی طرف رجوع کرتے تو یقیناً ایسے دھوکے میں نہ پڑتے کیونکہ ان کو معلوم ہو جاتا کہ "افسوس" کے جو معنی اردو میں مشہور ہیں اس کے سوا بھی یہ لفظ کچھ معنی رکھتا ہے۔ کتاب زیر تبصرہ ص ۱۷

حیف اس چار گرہ کپڑے کی قیمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

پہلے مصرعے میں بھی "قسمت" ہے "قیمت" نہیں۔ مصحح نے غالباً حسرت کے خیال کا تتبع کیا۔

ص ۳۸ قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے

اصل میں "کی" نہیں "کو" ہے اور یہ فارسی محاورے کے مطابق ہے

ص ۵۳ کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

اصل میں "میں" ہے نہ کہ "پہ"۔

ص ۸۷ تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں!

اصل نسخے میں "کر" نہیں بلکہ "کہ" ہے جس کو یقیناً "کر" پر ترجیح ہے۔

ص ۱۰۰ زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
دگرنہ ہم تو زیادہ توقع رکھتے تھے

توقع کا عین گرتا ہے اصل نسخے میں دوسرا مصرعہ یوں ہے:

وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے تھے

ص ۲۵۵

وضع میں اِس کو اگر جانیے قاف تریاق

اصل نسخے میں "جانیے" نہیں "سمجھئے" ہے۔

ص ۲۵۸ دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بہتر سہرا

لیکن غالب نے تو یوں کہا ہی:

دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

ص ۲۶۲ پر جو چوتھا شعر درج ہے اُسے دو شعر قبل یعنی پہلے شعر کے بعد ہی درج ہونا چاہئے تھا۔

ص ۲۶۸ ہے قلم میرا ابر گوہر بار

غالب نے اس مقام پر "قلم میری" لکھا ہے کسی کو کیا اختیار ہی کہ اُستاد کے لفظ کو بدلے۔

مکتبۂ جامعۂ ملیہ کے کارپردازان سے امید ہی کہ آئندہ اِشاعت میں صحت کا بہتر انتظام کریں گے اور غالب کو اصلاح دینے کی گستاخی کی تکرار نہ کریں گے۔

(ڈاکٹر عبدالستار صدیقی)

کرشمۂ عشق

یہ دیوان پیر شیر محمدؐ صاحب عاجز صدیقی چشتی نظامی کا ہے۔ اُن کے خاندان میں بڑے بڑے بزرگ ہوئے ہیں اور تصوف کا چراغ آپ کے گھرانے میں ہمیشہ روشن رہا ہے۔ خود بھی اس کا ذوق رکھتے ہیں۔ غزلیات میں کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہی کہ اگرچہ آپ کا وطن علاقہ سندھ میں ہی اور وہیں آپ نے نشو و نما پائی مگر زبان صاف اور فصیح ہے اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اہل زبان کا کلام نہیں۔

خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی نے اس پر دیباچہ لکھا ہے اور اکثر صاحبوں نے تقریظیں اور تاریخیں تحریر فرمائی ہیں۔ کتاب اعلیٰ حضرت حضور پر نور خسرو دکن خلد اللہ ملکہٗ کے نام سے معنون کی گئی ہی۔ حجم ۱۲۲ صفحہ قیمت عہ۔ پتہ۔ مینیجر کتب خانہ چشتی صدیقی۔ گھانگہ خورد۔ ڈاک خانہ جلال آباد

ضلع فیروز پور)

ترانۂ حبیب یہ بھی پیر صاحب موصوف کی ایک نعتیہ نظم ہے۔ یہ نظم بہت سیدھی سادی صاف اور بے تکلف لکھی گئی ہے جسے لڑکے لڑکیاں بھی آسانی سے پڑھ سکتی اور یاد کر سکتی ہیں۔ بحر بہت رواں اور آسان ہے (چھوٹی تقطیع پر ۳۶ صفحے۔ کاغذ اچھا۔ لکھائی جلی اور صاف قیمت ۵؍)

سیر و سفر یہ ہز اکسیلنسی راجہ راجایان سرکشن پرشاد مہاراجہ بہادر یمین السلطنۃ کے سی آئی ای۔ جی سی آئی ای کا سفر نامہ اورنگ آباد دولت آباد خلد آباد، بمبئی، احمدآباد، اجمیر متھرا، آگرہ وغیرہ مقامات کا ہے۔ جہاں کہیں تشریف لے گئے ہیں وہاں کے حالات بے تکلف بیان کئے ہیں۔ تاریخی حالات کا بھی جا بجا اضافہ کیا ہے جس سے کتاب میں لطف پیدا ہو گیا ہے۔ مہاراجہ سر یمین السلطنۃ بہادر حیدرآباد کے نہایت روشن خیال امیر ہیں علمی ذوق رکھتے ہیں۔ شعر و سخن کے دلدادہ۔ اردو نظم و نثر دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ آپ کا کلام ملک میں مشہور ہو چکا ہے۔ یہ سفر نامہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

مختار الصرف
(یعنی تصریف انگریزی و اردو)

ہر زبان میں فعل سب سے مشکل ہوتا ہے۔ جب تک فعل کی مختلف گردانوں اور صیغوں پر قدرت حاصل نہ ہو، زبان نہیں آسکتی۔ مولوی سید مختار احمد صاحب نے بڑی تفصیل کے ساتھ انگریزی فعل ~~~ کی تمام گردانیں ترتیب کے ساتھ مع اردو ترجمہ اور مثالوں کے اس رسالہ میں لکھ دی ہیں اور فعل کے استعمال کی کوئی صورت ایسی نہیں جو اس میں درج نہ ہو۔ طلبہ کو اس سے بڑی مدد ملے گی اور وہ آسانی کے ساتھ انگریزی فعل کے مختلف استعمالوں سے واقف ہو جائیں گے۔

(کتاب ٹائپ میں چھپی ہے۔ قیمت درج نہیں۔ مؤلف سے مل سکتی ہے۔ پتہ بیگم بازار۔ حیدرآباد دکن)

تاریخ

تاریخ الامت - حصّہ سوم - خلافت بنی اُمیہ

تاریخ الامت - مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری، استاد تاریخ اسلام جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کی تصنیف سے ہے۔ پہلے دو حصّے اس سے قبل شایع ہو چکے ہیں۔ یہ تیسرا حصّہ خلافت بنی امیہ پر ہے۔ یہ تاریخ مولانا نے صاف اور شستہ زبان میں لکھی ہے جو طلبا اور عام شایقین کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔ بنی امیہ کی تاریخ پڑھنے کے قابل ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کیونکر خلافت بادشاہت ہو گئی۔ جمہوریت کا رنگ بدل کر استبداد تک پہنچ گیا اور آزادی مفقود ہو کر غلامی آگئی۔ مولانا نے تمام واقعات سادہ طور سے بیان کر دئے ہیں اور تعصب اور طرف داری کو دخل نہیں دیا۔ جامعہ ملیہ قابل مبارک باد ہے کہ اس نے طلبا، اور عام پڑھنے والوں کے مطالعہ کے لئے کتابوں کا اچھا ذخیرہ جمع کر دیا ہے جس میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ کتاب اچھے کاغذ پر چھپی ہے۔ لکھائی اور چھپائی بھی اچھی۔ حجم ۶۰۴ صفحے قیمت عہ ہے جامعہ ملیہ علی گڑھ سے مل سکتی ہے۔

مذہب

(۱) **بصائر القرآن** قرآن پاک میں جا بجا مختلف قصّے اور روایتیں بیان کی گئی ہیں۔ جن کا مقصد لوگوں کو نصیحت دینا یا عبرت دلانا یا کوئی مفید سبق سکھانا ہے۔ مولوی محمد مہدی صاحب اسسٹنٹ مہتمم دفتر تاریخ ریاست بھوپال نے یہ بڑا اچھا کام کیا ہے کہ ان تمام قصّوں کو ایک جگہہ جمع کر کے کتاب کی صورت میں شایع کر دیا ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر انبیاء علیہم السلام کے قصّے ہیں اور علاوہ اُن کے دوسرے قصّے بھی مذکور ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے۔ قابل مؤلف نے یہ تمام قصّے بے کم و کاست اسی طرح بیان کئے ہیں جس طرح قرآن پاک میں لکھے ہوئے ہیں البتہ قوسین میں وضاحت کے لئے کہیں کہیں الفاظ اور جملے اضافہ کر دئے ہیں۔ اس کے سوا انھوں نے

اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہیں کی۔ اور سب قصّے صاف سیدھے اور شستہ زبان میں بیان کئے ہیں جسے چھوٹے بڑے سب آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ ایک مفید کام یہ کیا ہی کہ ہر قصّے کے آخر میں اس کے نتائج بھی لکھ دئے ہیں۔ جو بہت مفید اور سبق آموز ہیں۔

(کتاب بڑی تقطیع پر بہت اچھی چھپی ہی۔ قیمت عہ۔ حجم ۲۰۸ صفحے۔ ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال سے مل سکتی ہے)

(۲) اُسوۂ صحابیات

مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے یاران پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے درس آموز وہمت افزا وجذبات آفریں زندگی کے بعض خصائص اپنی تالیف "اسوۂ صحابہ" میں آشکار کئے تھے۔ اس میں صحابیات کے تذکرے بھی تھے۔ جو اب ایک علیحدہ رسالہ کی صورت میں "اسوۂ صحابیات" کے نام سے نظر افروز ہوا ہی۔

کوئی شک نہیں کہ جمع حوادث میں کافی محنت کی گئی ہے۔ بڑی بڑی کتابوں کے حوالے دئے ہیں جن میں بعض کے مقابلے ہم نے بھی کئے اور صحیح پائے۔ تاہم جناب مولوی صاحب کی محویت واستغراق اگر اجازت دے تو ایک دو باتیں عرض کرنے کی ہیں:

(۱) گوناگوں عنوانات میں کوئی بھی ایسا نہیں جو تشنۂ بحث نہ ہو۔

(۲) ہر ایک بیان مزید وسعت کا نیازمند ہی جس کے لئے کچھ تھوڑی سی اور بھی کاوش درکار تھی۔

(۳) جن مآخذ سے اقتباس یا استنباط کیا گیا ہی ویسے ہی بلکہ بعض صورتوں میں وہی ایسے حقایق پر بھی روشنی ڈالتے ہیں جو اس رسالہ میں چھوڑ دئے گئے مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے تفقہ کا سرسری بیان کافی نہ تھا جبکہ جن کتابوں سے یہ بیان ماخوذ ہی انھیں میں تفصیل بھی ہے۔

(۴) صحابیات کی زندگی کا خاکہ جس طرح بھرا گیا ہی وہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں موجودہ کوشش کہ حدیث کی ابتدائی کتابوں سے چند معمولی باتیں لے لیں، کوہ کندن وکاہ برآوردن سے کچھ کم نہیں۔

بہرحال رسالہ اچھا ہی، اور بہت اچھا۔ ملک کو اس کی قدر اور قوم کو اس سے عبرت پذیر ہونا چاہئے۔

(قیمت کتاب ۸؍ ہی۔ مسلم پرنٹنگ پریس اعظم گڑھ سے طلب کی جائے)

(۳) القول الفرقان فی توضیح حقائق القرآن

یہ رسالہ مولوی محمد علی صاحب ایم اے (کنٹب) نے حقائق القرآن کے جواب میں قوی دلائل اور پرزور طریقہ سے لکھا ہے۔ مولوی صاحب موصوف کیمبرج کے ایم اے اور رنگیلر ہی نہیں بلکہ عربی زبان اور علوم دینی میں بھی پوری دستگاہ رکھتے ہیں۔ اور قرآن کے مطالب و معانی پر بھی پوری طرح حاوی ہیں بمصنف نے حقائق القرآن میں قرآن مجید سے حضرت عیسی علیہ السلام کی فضیلت اور ان میں الوہی صفات کے اثبات کی کوشش کی ہے اور چودہ دلائل اپنے دعوی کے ثبوت میں پیش کئے ہیں۔ مولانا نے اس کی بڑی خوبی سے عقلی اور نقلی دلائل سے تردید کی ہے اور آخر میں عیسوی اور قرآنی تعلیم کا مقابلہ کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہے جو صاحب اس قسم کی بحثوں اور فن مناظرہ سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس رسالہ کو بہت پسند کریں گے۔

(چھوٹی تقطیع۔ حجم ۱۱۶ قیمت ۸ر۔ دفتر جمعیت دعوت و تبلیغ اسلام (۲۱۰ (۲) ایسٹ اسٹریٹ پونا سے مل سکتا ہے۔

---

(۴) اسلامی مساوات

اس رسالے میں مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب آنریری سکرٹری مسلم ایسوسی ایشن پھلواری شریف نے اسلامی تعلیم اور تاریخ سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام میں رنگ روپ، ذات پات کی کوئی تمیز نہیں اور سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ افسوس ہے کہ کتاب اچھی نہیں چھپی۔

(چھوٹی تقطیع حجم ۶۶ صفحے قیمت ۸ر۔ منیجر مسلم ایسوسی ایشن بک ڈپو پھلواری شریف۔ پٹنہ سے مل سکتی ہے۔

صنعت و حرفت

پارچہ باقی

یہ کتاب ایم ایچ بھٹی بی اے، بی ٹی کی تالیف ہے۔ جس میں دیسی کرگھے اور فلائی شٹل پر کپڑا تیار کرنے کے آسان سے آسان طریقے بتائے گئے ہیں اور تمام ضروری ہدایح

یعنی سوت سے لے کر کپڑا بننے تک کے حالات بہت شرح وبسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اردو زبان میں اب تک ایسی جامع کتاب اس فن پر شایع نہیں ہوئی۔ جا بجا تصویروں کے ذریعہ سے ضروری امور کو واضح کیا ہی۔ کتاب بہت صاف اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہی اور قابل مؤلف کی نظر تمام جزئیات پر معلوم ہوتی ہی اور ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی اس خوبی اور تفصیل سے بیان کیا ہی کہ ناواقف شخص بھی سمجھ جائے اور کام کرنے لگے۔ ایسے وقت میں جب کہ تمام اقوام ہند کے بزرگوں نے دیسی کپڑا پہننے اور چرخا کاتنے کو جزو ایمان قرار دیا ہی، یہ کتاب رہنما کا کام کر سکتی ہی۔ نیز تمام مدارس صنعتی میں بطور نصاب کے داخل کی جا سکتی ہی۔ اس کتاب نے ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہی اور اس کے قابل مؤلف منشی محمد حسین صاحب بی اے، بی ٹی قابل مبارکباد ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اہل ملک ضرور اس کی قدر کریں گے۔

(کتاب اچھی چھپی ہے۔ حجم ۱۷۲ صفحے قیمت درج نہیں۔ کارخانۂ لباس۔ گوجرانوالہ (پنجاب) سے مل سکتی ہے)

اردو کے جدید رسالے

اردوے معلیٰ اردوے معلیٰ کا نام سنتے ہی اردو کے مشہور شاعر اور ادیب مولانا حسرت موہانی یاد آجاتے ہیں۔ اُن کے رسالے نے اردو زبان کی بہت بڑی خدمت کی ہی جو ہمیشہ شکر گزاری کے ساتھ یاد کی جائے گی۔ اب اسی نام سے ایک بتیس صفحہ کا ماہوار رسالہ دلی سے قربان علی صاحب بسمل کی اڈیٹری میں شایع ہوا ہی۔ اردو معلیٰ کو دلی سے خاص نسبت ہی لیکن اپنے نام اور مقام کے لحاظ سے جیسا یہ رسالہ ہونا چاہیے تھا ویسا نہیں ہے۔ مضمون زیادہ تر دوسرے رسالوں سے ماخوذ ہیں اور باستثنا ردو کے سب کے سب خیالی ہیں مثلاً دردِ دل، آخری وقت، عذرا کی سرگزشت، عالم خیال، تصویر جاناں، ایک پارسی ڈرامہ کو دیکھ کر۔ آخر میں چند صفحے نظم کے ہیں۔ ان میں بھی بعض نظمیں منقول ہیں۔ لیکن قیمت اس قدر کم ہی کہ اس میں اس سے بہتر رسالے کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ یعنی صرف ایک روپیہ سالانہ ہے۔

مرج البحرین

یہ رسالہ بھی دلی سے شایع ہوا ہی۔ رسالے کے مقاصد کے متعلق اڈیٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "رسالہ کی اجرا کا سبب یہ ہی کہ ہم کسی مخصوص صنف کو تو رسالہ کے لئے موزوں نہ کریں کیونکہ بعض رسالے محض مذہبی شان کے ساتھ مخصوص ہیں، بعض تاریخی حالات کے ساتھ، بعض محض طبی ہیں اور بعض ادبی رنگ میں ہیں اور بعض مختلف صنف میں بھی ہیں۔ لیکن ہم انشاءاللہ مذہب اور طب اور تاریخ وادب کے ماسوا گزشتہ علوم وفنون اور متقدمین کے پسندیدہ کارآمد مقالات بھی درج رسالہ کریں گے، اس سے رسالہ کے مقاصد اور اس کی شان تحریر دونوں ظاہر ہیں۔ مختلف مضامین ہیں۔ لیکن ان میں یا تو مذہبی رنگ ہی یا بالکل خیالی ہیں۔ اور جن کا تعلق مذہب سی ہے اُن میں بھی تخیل غالب ہی۔ چند نظمیں میں بھی ہیں۔ لکھنے والوں میں علاوہ اور صاحبوں کی خواجہ حسن نظامی صاحب، ملا واحدی صاحب، راشد الخیری صاحب، آغا شاعر صاحب، حکیم محمد نذیر صاحب اور حکیم سید ناصر نذیر صاحب بھی ہیں۔

اڈیٹر حافظ محمد باقر علی صاحب ایمن چشتی القادری۔ حجم ۵۰ صفحے قیمت سالانہ دو روپیہ۔ قاسمی پریس دہلی سی شایع ہوتا ہے۔

پنجابی خیالات

اس نام کا ماہوار رسالہ بھی دلّی ہی سے شایع ہوا ہی۔ اڈیٹر احمد وجودی۔ سرپرست خواجہ حسن نظامی۔ رسالے کا نام، اڈیٹر اور سرپرست تینوں کے تینوں عجیب وغریب ہیں۔ سرورق پر اس کا مقصد یہ لکھا ہی "ہر قسم کے پنجابی خیالات کی معلومات عامہ کا پورا ذخیرہ، پنجاب کے تمام اخبارات ورسائل ومجالس عامہ کی تحریروں وتقریر کا خلاصہ" اور اس کے پانچ باب قرار دئے ہیں۔ پہلا باب مذہبی خیالات۔ دوسرا، سیاسی خیالات؛ تیسرا، معاش کے خیالات؛ چوتھا صحت کے خیالات، پانچواں معلومات عامّہ غرض سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ یعنی ہر قسم کے مضامین دوسرے اخباروں اور رسالوں سے نقل کرکے رکھ دیتا ہی مخالف وموافق سب موجود ہیں، اگر خود خاموش ہیں۔ دین ودنیا کے مالک حضرت خواجہ حسن نظامی نے اس رسالہ کے مقاصد پر ایک چھوٹا سا مضمون بھی لکھا ہی وہ فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق صرف صوبہ پنجاب سی ہے کہ وہ اس صوبے کے خیالات کے مجموعہ کو اہل پنجاب اور دوسرے صوبوں کے سامنے پیش کرے اور بہت سی رسالے اور اخبار پڑھنے کی ضرورت باقی نہ رہی اس کے بعد فرماتے ہیں" اس رسالہ کا مقصد محض یہ ہی کہ آئینہ کی طرح ہر چیز کی صورت دکھادے،

یہ نہیں کہ کسی کے عیب و ہنر پر رائے زنی کرے یعنی جو خیالات اس رسالہ میں درج کئے جائینگے ان میں رسالہ کے مولف کی ذاتی رائے کو دخل نہ ہوگا، ہماری رائے میں یہ رسالہ صرف وہی شخص پسند کرسکتا ہی جس کی کوئی ذاتی رائے نہیں ہی۔ ورنہ اس جھولی کے رنگ برنگ ٹکڑے کون ہضم کرسکتا ہی۔ البتہ دلچسپ ضرور ہی۔ ہر فریق اور ہر مذہب والے کی رائے اور خیالات بے کم و کاست درج ہیں۔ موالاتی بھی ہیں اور تارک موالات بھی، عیسائی بھی اور غیر عیسائی بھی، آریائی بھی اور سناتن دھرمی بھی، قادیانی بھی اور ان کے مخالف بھی، غرض ہر قسم کی رائیں اور ہر قسم کے مضامین موجود ہیں۔ پنجاب کے اخباروں اور رسالوں کا خلاصہ ہی۔ جو پڑھے سو پچھتائے اور جو نہ پڑھے سو پچھتائے۔ بڑی تقطیع پر ۳۲ صفحے اور ہر صفحے کے دو کالم۔ قیمت بہت سستی یعنی ایک روپیہ سال، ایسی سستی قیمت میں ایسا مزیدار رسالہ ملنا ناممکن ہی۔

حُسن ادب لکھنؤ یہ بھی ماہانہ رسالہ ہی۔ اڈیٹر ابو الکمال محمد واحد علی لطف لکھنوی اور سرپرست حضرت آزاد لکھنوی ہیں۔ نثر اور نظم دونوں کا مجموعہ ہی اس نمبر میں جو ہمارے پاس پہنچا ہی۔ پہلا مضمون مرزا سلطان احمد صاحب کا ہی۔ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا بدنصیب رسالہ ہوگا جو جناب مرزا صاحب کا پُرنویس قلم کا زیر بار احسان نہ ہو۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا ہی کہ رسالے کے وجود میں آنے سے پہلے نہیں بلکہ خیال میں آنے سے قبل آپ کا مضمون پہنچ گیا ہی۔ یہ مضمون "مذہبی علمی رنگ میں ہی" اور مرزا صاحب نے اپنے خاص رنگ میں لکھا ہی۔ یعنی الفاظ، جملے، فقرے، سب سمجھ میں آتے ہیں لیکن مضمون بحیثیت مجموعی فہم سے کترا کر نکل جاتا ہی دو تین اور مضمون بھی ہیں ان میں بھی زیادہ تر خیالی تک بندی ہے۔ صرف و نحو کے تحت میں نتی پر ایک مضمون ہی اور اس کے بعد چند نظمیں ہیں۔ بہت معمولی رسالہ ہی افسوس ہے کہ دہلی اور لکھنؤ سے کوئی قابل قدر علمی رسالہ شایع نہیں ہوتا کاغذ لکھائی چھپائی معمولی بلکہ معمولی سے بھی کم۔ قیمت عہ سالانہ

درویش یہ ایک پندرہ روزہ رسالہ ہی جو حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ سے شایع ہوتا ہی۔ اڈیٹر ملا محمد الواحدی ہیں اس رسالہ کو بھی خواجہ حسن نظامی صاحب کی سرپرستی اد

رایت کا فخر حاصل ہی۔ مقصد نام سے ظاہر ہی لیکن اہم مقصد یہ بتایا گیا ہی کہ وُہ "اشاعت اسلام اور تبلیغ مذہب کے مفید ذرائع کی طرف رہ نمائی کرے گا" جس کا سب سے بڑا ذریعہ غالبًا مریدی معلوم ہوتا ہی۔ علاوہ اس مقصد کے وہ "ملک کے دیگر اہم مسائل پر بھی سنجیدگی کے ساتھ رائے ظاہر کرے گا" اور اس میں شبہ نہیں کہ رسالہ کا جو مقصد انھوں نے بیان کیا ہی اُسے پورا کرنے کی بہت کوشش کی گئی ہی مگر اس میں سب سے عجیب اور قابل دید وہ خطوط ہیں جو مریدان باعقیدت نے اپنے پیر طریقت یعنی خواجہ صاحب کے نام لکھے ہیں۔ اور حضرت پیر نے بڑے شوق اور فخر سے ان کو درج کیا ہی۔ یہ خط اشتہار کا بھی کام دیتے ہیں، ترغیب کا بھی، ایک طرف مرید کی حسن عقیدت بتاتے ہیں اور دوسری طرف پیر کی حکمت نفسیاتی۔ پیری کی کامیابی کے لئے ضروری ہی کہ پیر دین کو سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو مگر دنیا کو خوب سمجھتا ہو اور انسانی فطرت کی گہرائیوں پر پورا عبور رکھتا ہو۔ ان خطوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہی کہ خواجہ صاحب اس فن شریف کے امام ہیں اور اس لئے ہم اُن کی دل سے قدر کرتے ہیں اگرچہ اس رسالہ میں ملک کے دوسرے مسائل پر بحث کی جاتی ہی مگر وہ سب اصل مقصد کے ماتحت ہیں۔ گویا دوسرے مضامین اصل مضمون کے لئے چاشنی کا کام دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی طبیعت میں جدّت پائی جاتی ہی اور اس سے وہ ہر جگہ کام لیتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے شذرات اور اڈیٹوریل نوٹس کی جگہ رسالے کی خصوصیت کے لحاظ سے تجلیات کا لفظ تجویز فرمایا ہی جس میں وہ مزے مزے کے چٹکلے اور رنگ برنگ کی گل افشانیاں فرماتے ہیں اس کے بعد دوسرے مضامین ہوتے ہیں جن میں سیاسیات، یادِ رفتگاں، منقولات، نقد و نظر، مواعظ حسنہ، کیف سخن سب ہی کچھ آجاتا ہی۔ اچھا خاصا گلدستہ ہی مگر رنگ بو خاص رکھتا ہی۔

چشم بد دور، خواجہ صاحب کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہی اب اس میں اشاعت و تبلیغ اسلام کا اور اضافہ ہوا ہے جس نے عقیدتمند مریدوں کے دلوں میں نیا ولولہ اور جوش پیدا کر دیا ہی یہ ایک اور ثبوت ہی اس بات کا کہ خواجہ صاحب کی نظر کس قدر غائر ہے اور وہ انسانی فطرت کے اسرار کے سمجھنے میں کس قدر کمال رکھتے ہیں۔ اور جب ہم ان کی تازہ تصانیف حلال خور، ہندو مذاہب کی معلومات، سکھ قوم وغیرہ کا اشتہار اس رسالے میں دیکھتے ہیں تو ہم ان کے مشرب کی وسعت اور ہمہ گیری کی داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے اور وہ دن دور نہیں کہ یہ باتیں ضرور کوئی نیا رنگ لائیں گی۔

درویش ایک دلچسپ رسالہ ہو۔ معلومات بھی اس میں مختلف قسم کی ہیں۔ زبان بھی اس کی فصیح اور بے تکلف ہے۔ لیکن ان کے سوا بھی اس میں ایک ایسی چیز ہو جو دوسرے رسالوں میں نہیں پائی جاتی اور اس سے پڑھنے کے قابل ہو۔ درویش ' درویشی سکھائے یا نہ سکھائے لیکن اس میں شک نہیں کہ پیر پرستی ضرور سکھا دیگا۔ اس سے مذہب اسلام کی اشاعت و تبلیغ میں کامیابی ہو یا نہ ہو لیکن اس میں کلام نہیں کہ مریدی کی اشاعت میں اسے ضرور کامیابی ہوگی جو لوگ ملک کے مختلف حالات اور مسائل کے علم کا شوق رکھتے ہیں وہ زندگی کے اس اہم شعبہ کو بھی ضرور مطالعہ فرمائیں۔ کیونکہ پیری مریدی بھی الم (علم) دریاؤ سے ہے۔

درویش بڑی تقطیع پر دو کالموں میں چھپتا ہو۔ چھپائی گنجان اور صاف ہوتی ہو۔ کاغذ اچھا حجم ۱۶ صفحے مہینے میں دو بار شایع ہوتا ہو سالانہ چندہ دو روپیے۔

لسان الملک حیدرآباد دکن میں ایک اور ماہانہ رسالے کا اضافہ ہوا ہو اس کے اڈیٹر اردو کے مشہور شاعر سید محمد ضامن صاحب کنتوری ہیں جن کے کلام سے شعر و سخن کے شایق خوب واقف ہیں۔ یہ پہلا نمبر ہے جو جولائی میں شایع ہوا تھا اس کے بعد سے کوئی رسالہ وصول نہیں ہوا۔ اس میں ۱۹ مضامین ہیں جن میں سے ۹ نظمیں ہیں اور دس مضمون نثر کے ہیں۔ مضامین ہر قسم کے ہیں۔ مضامین نگاروں میں جناب مرزا سلطان احمد صاحب بھی ہیں۔ مرزا صاحب کی پرنویسی پر رشک آتا ہو۔ یہ مضمون "رنج و خوشی" پر ہو اور اُن کی خاص طرز میں ہو ایک مسلسل ناول کی پہلی قسط بھی نظر آتی ہو۔ معلوم نہیں کہ یہ ترجمہ ہے یا تصنیف۔ اس کے لکھنے والے جناب مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب ہیں۔ کوئی مضمون خاص طور پر ایسا نہیں ہو جو علمی تحقیق، معلومات یا جدت کے لحاظ سے قابل توجہ ہو۔ حضرت ضامن نے لارڈ ٹنی سن کی اینک آرڈن کا اردو میں ترجمہ کیا ہو۔ اس مثنوی کا کچھ ابتدائی حصہ اس میں شایع ہوا ہو۔ ترجمہ بہت بے تکلف، رواں، فصیح اور شگفتہ ہو۔ ضامن صاحب کے جائنٹ اڈیٹر سید منظر علی صاحب اشہر ہیں۔

(حجم ۱۴۴ صفحے۔ قیمت پانچ روپیہ سالانہ)

ایک فارسی زبان کا رسالہ

ایران شہر فارسی زبان کا علمی اور ادبی باتصویر رسالہ۔ مقام اشاعت: برلین (جرمانیا) سالانہ چندہ ایک انگریزی پاؤنڈ۔ ہندوستان کے لئے مرزا محمد حسن گازرونی، تجارت خانہ دہ دشتی بمبئی گماشتے کے طور پر کام کرتے ہیں۔

یہ ماہانہ رسالہ ذی قعدہ ۱۳۴۱ھ سے آقا حسین کاظم زادہ کی ادارت میں برلین سے نکلتا ہی۔ مُدیر کے اعلان سی معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر مہینے میں دو بار نکلا کرے گا۔ حجم پہلے ۱۶ صفحے تھا لیکن اب ۳۲ صفحے ہی۔ چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ ہی۔ عبارت فصیح اور عام فہم۔ مضامین دلچسپ اور مفید۔ سب سی بڑی خوبی اس رسالہ میں یہ ہی کہ جو مضمون اس میں چھپنے کو بھیجا جاتا ہی۔ مدیر کو اُس کی عبارت درست کرنے کا پورا اختیار ہی۔ چنانچہ پہلے ہی شمارے میں کہ دیا گیا ہے۔

"ادارہ ایران شہر، در اصلاحِ عبارات مقالہ ہا، بدون دست زدن بہ اصلِ مطلب، آزاد است"

کاش اردو رسالوں میں بھی یہی انتظام ہو تا کہ غلط سلط عبارت نہ چھپنے پاتی۔ آج کل اُردو رسالے غلط ترکیبوں، نامانوس لفظوں اور اور خرابیوں سے بھرے ہوتے ہیں۔

پہلے چھ پرچوں میں جو مضمون درج ہیں ان میں سے یہ خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں:-

(۱) تشکیلاتِ داریوش اول درکشور ایران (ہخامنشی خاندان کے نامور بادشاہ داریوش کے نظم و نسق پر)

(۲) شرق شناسی و غرب شناسی۔

(۳) تعلیم و تربیت درمیان ایرانیان قدیم۔

(۴) جنگِ دارا و اِسکندر و انقراض سلطنت ہخامنشیان (باتصویر)

(۵) شورائے جنگیٔ داریوش اوّل (باتصویر)

(۶) ایران شہر (برلین کے مشہور ایران شہر، استاد مارکوارٹ کے قلم سے)

(۷) خطہائے میخی در کتیبہ ہائے ایران

(۸) نامۂ یزدگرد دوم بہ عیسویان ارمنستان (آج کل کے ایک مشہور وطن پرست ایرانی شاعر پورداؤد کے قلم سے)

(۹) داستان خُم نشستنِ افلاطون (با تصویر)

(۱۰) علم اساطیر (ڈین مارک کے مشہور ایران شناس، استاذ کریستنسن کے قلم سے)

ان میں اکثر مضمون تاریخی ہیں اور مستند جرمانی یا فرانسیسی کتابوں سے لئے یا ترجمہ کئے گئے ہیں۔ مضمون نشان (۶) کو استاذ مارکوارٹ نے جرمانی زبان میں لکھا تھا جسے رسالے کے کارپردازان نے فارسی میں لکھ کر چھاپا ہی مگر فارسی ترجمے پر بھی مصنف نے نظر ثانی کر کے کہیں کہیں اصلاح دی۔ خود اُن کے نام کے ساتھ "پروفیسر" لکھا گیا تھا۔ مگر اس یورپی لفظ کو فارسی تحریر میں انھوں نے ناپسند کر کے "اندُرزبَد" بنا دیا کہ درمیانی زمانے کی فارسی میں (جسے بعضے لوگ "پہلوی" کہتے ہیں) مُعلّم کے لئے "اندُرزبَد" استعمال ہوتا تھا۔ مضمون نشان (۱۰) اُستاذ کریستنسن کی فارسی انشاپردازی کا نمونہ ہے۔

"ایران شہر" والوں نے یورپی لفظوں یا اصطلاحوں کا ترجمہ فارسی میں خوب کیا ہی۔ ان میں بعضے ایسے لفظوں کا فارسی ترجمہ بھی ہے جن کے عربی مرادف ایران اور ہندوستان میں استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن "ایران شہر" نے جو ٹھیٹ فارسی لفظ پیش کئے ہیں ان میں بیشتر موزوں اور عام فہم ہیں۔ من جملہ اُن کے تھوڑے سے یہاں لکھے جاتے ہیں

شرق شناس = (متشرق) orientalist

ایران شناس = Iranist

مصر شناس = Aegyptologist

عرب شناس = Arabist

غرب شناس = occidentalist

شاہ کار = masterpiece

اندُرزبُد = Professor

سنگ نبشتہ = (کتبہ) Inscription

چیز نویسی = The art of writing articles (Journalism)

علم اساطیر = Folklore

رسم خط میں بھی کہیں کہیں اصلاح کی گئی ہے چنانچہ "کتاب خانہ" (یعنی ایک کتاب خانہ) کے بجائے "کتاب خانہ اے" وغیرہ لکھا ہے۔ مگر بھلا ہندوستان کے حضرات کاہے کو مانیں گے۔

(ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ پی ایچ ڈی)

انجمن ترقی اردو کا ذکر

انجمن کے ارکان اور بہی خواہوں کی اطلاع کے لئے یہ ضروری ہی کہ انجمن کے کاموں کا ذکر وقتاً فوقتاً اس رسالہ میں ہوتا رہے اس وقت جو جو ترجمے اور تالیفات زیر ترتیب یا طبع ہیں یا اور جو کام انجمن کر رہی ہی یا اس کے مد نظر ہیں، ان کا ذکر مختصر طور سے ذیل میں کیا جاتا ہی۔

۱۔ گزشتہ ماہ ذی حجہ میں ایک مجلس کا انعقاد اس غرض سے کیا گیا کہ اردو رسم خط میں بعض ضروری اصلاحوں پر غور کرے اور اردو میں اوقاف کا تعین کرے ۔ اس کی مفصل رپورٹ اسی رسالے میں کسی دوسری جگہہ درج ہی۔

۲۔ سرگزشت حیات مترجمہ جناب مولوی نظیر حسین صاحب فاروقی ۔ یہ بہت ہی دلچسپ اور مفید کتاب ہی اس میں حیات کی ابتدا اور اس کے ارتقا کا حال اور پھر انسان کی زندگی کے مختلف شعبوں کا ذکر نہایت سلاست اور خوبی سے کیا گیا ہی ۔ اور ہر مسئلے کا سائنس کی جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں مطالعہ کیا گیا ہی ۔ اس کی پہلی جلد زیر طبع ہے ۔

۳۔ اس سال سرکار نظام نے جناب نواب مسعود جنگ بہادر (جناب سید راس مسعود صاحب) ناظم تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی کو خاص طور پر جاپان کے تعلیمی حالات کے مطالعہ کے لئے بھیجا تھا ۔ نواب صاحب موصوف نے وہاں سے آکر سرکار میں پیش کرنے کے لئے ایک رپورٹ لکھی جو نہایت دلچسپ اور پر از معلومات ہی۔ شروع میں ضروری تاریخی حالات ہیں ۔ اس کے بعد جاپان کی ترقی کا راز، وہاں کے تعلیمی نظام وغیرہ پر مفصل طور سے لکھا ہی۔ اس سے بہتر کتاب جاپان پر کوئی ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی ۔ یہ کتاب بھی زیر طبع ہے ، اور بفرمان اعلیٰ حضرت واقدس خلد اللہ ملکہ انجمن کو چھاپنے کے لئے دی گئی ہی ۔

۴۔ سرکار نظام نے مدارس وسطانیہ (مڈل اسکولوں) کے لئے مولوی سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی سے تاریخ ہند پر ایک کتاب لکھوائی ہی ۔ مولوی صاحب موصوف نے اس سے قبل میٹرکولیشن اور انٹرمیڈیٹ

کے لئے نہایت عمدہ ہندوستان کی تاریخیں لکھی ہیں۔ یہ کتاب بھی اُسی پایہ کی ہے اور صاف اور سلیس زبان میں لکھی ہے باجازت سرکار یہ کتاب بہت جلد انجمن طبع کرے گی۔

۵۔ تاریخ ادبیات ایران (مصنفہ پروفیسر براؤن) کا ترجمہ ایک مدت سے ہو رہا تھا۔ اب پہلی جلد بعد نظر ثانی تیار ہو گئی ہے۔ چونکہ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہے لہذا فی الحال ناظر مذہبی کتب درسیہ کے زیر تنقید ہے وہاں سے فراغت ہونے کے بعد طبع کے لئے دی جائے گی۔

۶۔ تاریخ ادبیات عرب (مصنفہ پروفیسر نکلسن) کا ترجمہ بھی قریب الاختتام ہے۔ شروع کے اجزا ناظر مذہبی کتب درسیہ کے زیر تنقید ہیں۔ اس کی طبع کا انتظام بھی جلد کیا جائے گا۔

۷۔ انجمن نے "Science Stories" کا ترجمہ سائنس کے قصوں کے نام سے کردیا ہے۔ اس کا مصنف ایک فرانسیسی عالم فابر ہے جو سائنس کے مسائل کو سلیس اور صاف ستھری زبان میں بیان کرنے میں کمال رکھتا ہے اور خاص کر حشرات الارض اور کیڑے مکوڑوں وغیرہ کے حالات ایسی دلچسپی سے لکھتا ہے جیسے دیو پریوں کے قصے، اس لئے اُسے حشرات الارض کا ہومر کہتے ہیں۔ ترجمہ ہو چکا ہے۔ نظر ثانی کی جا رہی ہے عام پڑھنے والوں اور لڑکوں لڑکیوں کے لئے بہت ہی اچھی کتاب ہے۔

زیر ترتیب لغات

انجمن اس وقت لغت پر کئی کتابیں تیار کر رہی ہے۔

۱۔ سب سے اول اصطلاحات علمیہ کی لغت ہے۔ اس کی پہلی جلد بالکل تیار ہے۔ صرف ترتیب دی جا رہی ہے ایک مہینے کے اندر ہی اندر طبع کے لئے بھیج دی جائے گی۔

۲۔ دوسری لغت پیشہ وروں کے اصطلاحات کی ہے۔ یہ بھی تیار ہو چکی ہے۔ صرف ترتیب باقی ہے جس کا کام جاری ہے۔ اس کی تیاری میں بہت محنت صرف ہوئی ہے بعد ترتیب تصویروں اور نقشوں کا انتظام کیا جائے گا۔ اور جب یہ سب مکمل ہو جائیں گے تو طبع کا انتظام ہو گا۔ یہ لغت بالکل جدید ہے اور نہایت مفید ثابت ہو گی۔ اب تک اس قسم کی کتاب ہماری زبان میں نہیں لکھی گئی۔

۳- تیسری لغت ، انگریزی سے اردو کی ہی - ترجمہ کے لئے Concise Oxford dictionary انتخاب کی گئی ہی جو انگریزی کی نہایت مستند لغت ہی - ایک ایک حرف ایک ایک صاحب کو ترجمہ کے لئے دیا گیا ہی جو حرف بہت طویل ہیں ان کے دو دو تین تین ٹکڑے کر کے مختلف صاحبوں کو دئے گئے ہیں - تقریباً تیس حضرات اس کے ترجمے میں مصروف ہیں - یہ پہلا علمی کام ہے جو اردو زبان میں مشترکانہ محنت اور اعانت سے انجام پائے گا - اس زمانے میں ایسی لغت کی جیسی کچھ ضرورت ہی وہ محتاج بیان نہیں -

۴- چوتھی لغت اردو زبان کی ہی - کئی سال ہوئے میں نے خاکے کے طور پر ایک مضمون لکھا تھا کہ اردو زبان کی لغت کیسی ہونی چاہیئے - اور ارادہ تھا کہ اسی نہج پر ایک محققانہ اعلیٰ درجہ کی لغت لکھی جائے - لیکن انجمن اس صرف کثیر کی متحمل نہ ہو سکی - اور نہ کوئی بیرونی امداد مل سکی - لہذا مجبوراً اس خیال کو ترک کرنا پڑا - اب بعد غور کے یہ تدبیر کی کہ پہلے ایک چھوٹی لغت لکھی جائے جس میں زبان کے کل الفاظ اور محاورات ، نیز جدید الفاظ جو اس زمانے میں زبان میں داخل ہو گئے ہیں درج ہوں - مختصر طور سے الفاظ وغیرہ کی تحقیق بھی کی جائے - غرض ایسی کتاب ہو جو عام طور پر اردو پڑھنے والوں اور طالب علموں کے لئے مفید ہو - لیکن جو کچھ لکھا جائے وہ مستند ہو علاوہ اس کے اس میں وہ قدیم الفاظ بھی درج کئے جائیں گے جو کسی اردو لغت میں نہیں ملتے مگر مسلّم اساتذہ کے کلام میں موجود ہیں تاکہ اردو زبان کے مطالعہ کرنے والوں کو مدد ملے - یہ کام شروع ہو گیا ہی اور انشاءاللہ ایک سال میں اختتام کو پہنچ جائے گا -

---

انجمن اردو نستعلیق ٹائپ کے تیار کرنے کی بھی فکر کر رہی ہی اس میں ایک حد تک کامیابی ہو چکی ہی اور امید ہے کہ بہت تھوڑے ہی عرصہ میں یہ ٹائپ تیار ہو جائے گا - اگر یہ ٹائپ خاطر خواہ تیار ہو گیا اور انشاءاللہ ضرور ہو جائے گا تو میں اسے انجمن کی بڑی کامیابی خیال کروں گا -

عبدالحق

سکرٹری انجمن ترقی اردو

فہرست مطبوعاتِ جامعۂ عثمانیہ سرکارعالی

نمبر سلسلہ	نام کتاب		قیمت
	فہرست کتب مدخلہ نصاب میٹریکیولیشن		
(۱)	تاریخِ انگلستان	کاغذ درجہ اوّل	ہے ۱۰/
	؍؍	کاغذ درجہ دوم	
۲	تاریخ ہند	کاغذ درجہ اول	للعہ ۵/
	؍؍	کاغذ درجہ دوم	سے ۱۴/
۳	طبیعیات حصّۂ اول		سے ۱۰/
	؍؍ حصّۂ دوم		للعہ ۱۵/
۴	کیمیا	کاغذ درجۂ اول	للعہ ۹/
	؍؍	کاغذ درجۂ دوم	للعہ ۳/
۵	ترسیمات ومساوات	کاغذ درجہ اول	سے ۱۲/
	؍؍	کاغذ درجہ دوم	سے ۷/
۶	مرقات		عہ ۱۱/
	؍؍ غیر مجلد		۱۲/
۷	جغرافیہ	کاغذ درجہ اول	
	؍؍	کاغذ درجہ دوم	

نمبر سلسلہ	نام کتاب			قیمت
	فہرست کتب مدخلہ نصاب جماعت ایف اے			
۸	علم مثلث حصّۂ اول			صہ ۸/
۹	جبرومقابلہ ؍؍			للعہ ۱۳/
۱۰	سکونیات			صہ ۵/
۱۱	ہندسی مخروطات			للعہ ۶/
۱۲	ہندسہ مجسمات			عہ ۱۴/
۱۳	علم حرکت			صہ ۴/
۱۴	طبیعیات	حصّہ اول		للعہ ۱۳/
	؍؍	حصّہ دوم	حرارت	للعہ ۱۵/
	؍؍	حصہ سوم	نور	سے ۱۴/
	؍؍	حصہ چہارم	آواز	عہ ۱۴/
	؍؍	حصہ پنجم	مقناطیس	عہ ۱۰/
	؍؍	حصہ ششم	برق	للعہ ۱۳/
۱۵	طبیعیات عملی	حصہ اول		عہ ۱۰/
	؍؍	حصہ دوم		[illegible]
	؍؍	حصہ سوم		عہ ۱۲/

نمبر سلسلہ	نام کتاب	قیمت
۱۶	کیمیا حصہ اول کاغذ درجہ اول	للعہ ۱۱ر
	" " کاغذ درجہ دوم	للعہ ۶ر
	" حصہ دوم کاغذ درجہ اول	
	" " کاغذ درجہ دوم	
	" حصہ سوم کاغذ درجہ اول	
	" " کاغذ درجہ دوم	
۱۷	تاریخ ہند حصہ اول	سے ۹ر
	" حصہ دوم کاغذ درجہ اول	صہ ۴ر
	" " کاغذ درجہ دوم	للعہ ۱۴ر
	" حصہ سوم کاغذ درجہ اول	سے ۱۳ر
	" " کاغذ درجہ دوم	سے ۹ر
	" حصہ چہارم کاغذ درجہ اول	سے ر
	" " کاغذ درجہ دوم	عہ ۱۳ر
۱۸	برطانوی حکومت ہند	سے ۴ر
۱۹	تاریخ یونان	سے ۵ر
۲۰	تاریخ انگلستان حصہ اول	للعہ ۱۵ر
	" حصہ دوم	سے ۱ر
	" حصہ سوم کاغذ درجہ اول	للعہ ۱۵ر
	" " کاغذ درجہ دوم	للعہ ۸ر
	تاریخ انگلستان حصہ چہارم کاغذ درجہ اول	سے ۷ر
	" " کاغذ درجہ دوم	صہ ۱۳ر
	" حصہ پنجم کاغذ درجہ اول	
	" " کاغذ درجہ دوم	
۲۱	تاریخ روما کاغذ درجہ اول	سے ۱۵ر
	" کاغذ درجہ دوم	سے ۱۵ر
۲۲	تاریخ دستور انگلستان	صہ ۹ر
۲۳	تاریخ یورپ حصہ اول کاغذ درجہ اول	
	" " کاغذ درجہ دوم	
	" حصہ دوم کاغذ درجہ اول	
	" " کاغذ درجہ دوم	
۲۴	تاریخ اسلام کاغذ درجہ اول	
	" کاغذ درجہ دوم	
۲۵	مقدمہ معاشیات کاغذ درجہ اول	للعہ ۷ر
۲۶	" کاغذ درجہ دوم	
۲۶	معاشیات ہند	للعہ ۱۲ر
۲۷	منطق	للعہ ۱۴ر
۲۸	مبادی علم نفس کاغذ درجہ اول	
	" کاغذ درجہ دوم	

نمبر سلسلہ	نام کتاب		قیمت فی جلد
	فہرست کتب مدخلہ نصاب جماعت بی اے		
۲۹	تاریخ دستور انگلستان	کاغذ درجہ اول	ے ۱ر
	〃	کاغذ درجہ دوم	ص ۸ر
۳۰	پرک لیز	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۳۱	ہندی مملکت برطانیہ	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۳۲	رنجیت سنگھ	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۳۳	تاریخ ہند عہد برطانیہ	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۳۴	قدیم تاریخ ہند	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۳۵	یورپ جدید	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۳۶	ویلزلی	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۳۷	یونانی شہنشاہی	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	

نمبر سلسلہ	نام کتاب		قیمت فی جلد
۳۸	تاریخ یونان جلد دوم	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۳۹	عروج فرانس	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۴۰	ڈلھاؤزی	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۴۱	مادھوجی سندھیا	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۴۲	تنبیہ والاشرف	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۴۳	تاریخ فرشتہ جلد اول	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
۴۴	کامل ابن اثیر جلد اول	کاغذ درجہ اول	
	〃	کاغذ درجہ دوم	
	〃 جلد دوم	کاغذ درجہ اول	
	〃 〃	کاغذ درجہ دوم	
	〃 جلد سوم	کاغذ درجہ اول	
	〃 〃	کاغذ درجہ دوم	
۴۵	طبیعیات نور	کاغذ درجہ اول	

نمبر سلسلہ	نام کتاب		قیمت
۴۵	طبیعیات نور	کاغذ درجہ دوم	
	″ آواز	کاغذ درجہ اول	
	″ ″	کاغذ درجہ دوم	
۴۶	طبیعیات عملی مقناطیس و برق	کاغذ درجہ اول	
	″ ″	کاغذ درجہ دوم	
۴۷	عملی کیمیا	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۴۸	نظری نامیاتی کیمیا	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۴۹	غیر نامیاتی کیمیا	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۵۰	علم مثلث تحلیلی حصہ دوم	کاغذ درجہ اول	
	″ ″	کاغذ درجہ دوم	
۵۱	سکون و سیالات	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۵۲	ہندسہ تحلیلی	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۵۳	جبر و مقابلہ حصہ دوم	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۵۴	حکمت الاشراق	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	

نمبر سلسلہ	نام کتاب		قیمت
۵۵	مفتاح المنطق	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۵۶	علم الاخلاق	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۵۷	معیشت الہند	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۵۸	اصول معاشیات	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۵۹	دہرم شاستر	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۶۰	قانون ٹارٹ	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	
۶۱	شرح محمدی	کاغذ درجہ اول	
	″	کاغذ درجہ دوم	

نوٹ

(۱) جن کتابوں پر قیمتوں کا اندراج نہیں ہے وہ زیر طبع ہیں۔

(۲) فرمایش کے ساتھ کتب مطلوبہ کی ربع قیمت پیشگی وصول ہونے پر بعد منہائی رقم وصول شدہ کتابیں ذریعہ وی پی روانہ کی جائیں گی

(۳) پیٹہ کے مصارف خریدار کے ذمہ ہونگے۔

(۴) جملہ خط وکتابت ناظم شعبہ تالیف و ترجمہ سے ہونی چاہیے

ناظم

شعبہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

مطبوعات انجمن

تذکرۂ شعرائے اردو۔ مؤلفہ میر حسن دہلوی۔
میر حسن کے نام سے کون واقف نہیں۔ اُن کی مثنوی بدر منیر
کو جو قبول عام نصیب ہوا شاید ہی اردو کی کسی کتاب کو
نصیب ہوا ہو۔ یہ تذکرہ اُسی مقبول اور نامور استاد کی تالیف
ہے۔ یہ کتاب بالکل نایاب تھی بڑی کوشش سے بہم پہونچا کر
طبع کی گئی ہے۔ میر صاحب کا نام اس تذکرہ کی کافی شہادت
ہے۔ اس پر مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے
ایک بسیط نقادانہ اور عالمانہ تبصرہ لکھا ہے جو قابل پڑھنے
کے ہے۔ قیمت فی جلد مجلد عہ/ کلدار غیر مجلد عہ کلدار

تاریخ تمدن۔ سر ٹامس بکل کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ
ہے۔ الف سے یے تک تمدن کے ہر مسئلہ پر کمال جامعیت
سے بحث کی گئی ہے اور ہر اصول کی تائید میں تاریخی اسناد
سے کام لیا گیا ہے اس کے مطالعہ سے معلومات میں
انقلاب اور ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ حصۂ اول
عہ/ کلدار حصۂ دوم عا/ کلدار

مقدمات الطبیعات۔ یہ ترجمہ ہے مگر انگلستان
کے مشہور سائنس داں حکیم ہکسلے کی کتاب کا جس کا نام
کتاب کی کافی ضمانت ہے اس میں بظاہر فطرت کی بحث
درج ہے لیکن کتاب علم و فضل کا مرقع ہے۔ عا/ کلدار

القول الاظہر۔ امام ابن مسکویہ کی معرکۃ الآرا تصنیف
فوز الاصغر کا یہ اردو ترجمہ ہے یہ کتاب فلسفہ الہین کے
اصول پر لکھی گئی ہے۔ اور مذہب اسلام پر انہیں اصول
کو منطبق کیا گیا ہے۔ قیمت عہ/ کلدار

رہنمایانِ ہند۔ مشہور کتاب پرونٹس اوف انڈیا
کا ترجمہ ہے۔ ہندو مذہب کے برگزیدہ عقائد کا بیان
فاضلانہ مگر دلکش پیرایہ میں لکھا ہے۔ اس کے بعد سری کرشن
جی مہاراج گوتم بدھ وغیرہ کے حالات ہیں۔ عہ/ کلدار

القمر۔ قوانین حرکت و سکون اور نظام شمسی کی صراحت کے
بعد چاند کے متعلق جو جدید انکشافات ہوئے ہیں اُن سب کو
جمع کر دیا ہے طرز بیان دلچسپ اور کتاب ایک نعمت ہے۔ ا/ کلدار

البیرونی۔ کمالات ذہنی میں ابوریحان بیرونی کا مرتبہ
تعریف سے مستغنی ہے۔ دسویں صدی کا فاضل ہے مگر تبحر علمی
اور دقیق النظری میں بیسویں صدی کا محقق معلوم ہوتا ہے
البیرونی کے حالات زندگی اور کمالات علمی پر مشتمل ہے قیمت مجلد عہ/

قاعدہ و کلید قاعدہ۔ یہ قاعدہ مدت کے غور
و خوض کے بعد اور بالکل جدید طرز پر لکھا گیا ہے جن اصول
اور طریقہ پر اس کی تعلیم ہونی چاہیے اُن کی تشریح کے
لیے ایک کلید بھی طیار کی گئی ہے قاعدہ ۲/ کلدار کلید قاعدہ ۴/

فلسفہ تعلیم - ہربرٹ اسپنسر کی مشہور تصنیف اور مسئلہ تعلیم کی آخری کتاب ہی۔ غور و فکر کا بہترین کارنامہ والدین و معلم کے لیے چراغ ہدایت ہے۔ تربیت کے ربانی قوانین کو اسقدر صحت کے ساتھ مرتب کیا ہی کہ کتاب الہامی معلوم ہوتی ہی اس کا نہ پڑھنا گناہ ہے۔ قیمت (عہ) کلدار

نپولین اعظم - ایبٹ کی مستند کتاب کا اُردو ترجمہ، کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ نپولین کی زندگی بشری جد و جہد کا آخری باب ہی۔ واقعات کی داد یا تو سکندر کی زبان ادا کر سکتی ہی یا تیمور کی زبان۔ ترجمہ آسان اور عام فہم ہے۔ قیمت عہ کلدار

دریائے لطافت - ہندوستان کے مشہور سخن سنج میر انشاء اللہ خاں کی تصنیف ہے اُردو صرف نحو اور محاورات اور الفاظ کی پہلی کتاب ہی۔ اس میں زبان کے متعلق بعض عجیب و غریب نکات درج ہیں۔ قیمت - عہ کلدار

طبقات الارض - اس فن کی پہلی کتاب ہی تین سو صفحوں میں تقریباً جملہ مسائل قلمبند کیے ہیں۔ کتاب کے آخر میں انگریزی مصطلحات اور اُن کے مرادفات کی فہرست بھی منسلک ہے۔ قیمت۔ عکار کلدار

مشاہیر یونان و روما - ترجمہ ہے سیرت نگاری اور انشاپردازی میں اصل کتاب کا مرتبہ دو ہزار برس سے آج تک مسلم الثبوت چلا آتا ہی۔ دنیائے عالم بلکہ شکسپیر تک نے اس چشمہ سے فیض حاصل کیا ہی۔ وطن پرستی اور بے نفسی عزم جوانمردی کی مثالوں سے اس کا ہر ایک صفحہ معمور ہے جلد اول غیر مجلد (عہ) کلدار جلد دوم غیر مجلد عہ کلدار

اسباق النحو - ملک کے ادیب کامل مولانا حمید الدین صاحب بی اے کی تالیف ہی۔ اختصار کے باوجود عربی صرف و نحو کا ہر ایک ضروری مسئلہ درج ہی قیمت ۱ر کلدار

علم المعیشت - اس کتاب کی تصنیف سے پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم نے ملک پر بہت بڑا احسان احسان کیا ہے۔ معیشت پر یہ کتاب جامع و مانع ہے۔ مبہم و مشکل مسائل کو پانی کر دیا ہے۔ اس کے اکثر باب نہایت عجیب و غریب ہیں - اشتراکیت کا باب قابل دید ہے - حجم ۸۰۰ قیمت مجلد صہ کلدار

تاریخ اخلاق یورپ - اصل مصنف پروفیسر لیکی کا نام علم و تبحر، تحقیق و صداقت کا مرادف ہی یہ کتاب کئی ہزار برس کے تمدن معاشرت، اصول اخلاق مذاہب و خیالات مرقع ہی۔ حصہ اول (عہ) حصہ دوم مجلد عہ کلدار

تاریخ یونان قدیم - یہ کتاب مطالب کے لحاظ سے مستند کتابوں کا خلاصہ ہے۔ اور زبان کے لحاظ سے سلاست و شگفتگی کا نمونہ اس کا نقطۂ خیال خالصاً ہندوستانی ہے ایف اے کلاس کے طلبا جو یونانی قدیم تاریخ سے گھبراتے ہیں اس کتاب کو انتہا درجہ مفید پائیں گے مجلد عہ کلدار

انتخاب کلام میر۔ میر تقی میر تاج شعرائے اُردو کے
کلام کا انتخاب ہے مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن
ترقی اُردو نے یہ انتخاب ایک مدت کی سعی و محنت کے بعد کیا ہے
اور شروع میں میر صاحب کی خصوصیات شاعری پر ۴۸ صفحہ کا
ایک عالمانہ مقدمہ بھی لکھا ہے۔ قیمت ۵ ر کلدار

رسالہ نباتات۔ اس موضوع کا پہلا رسالہ ہے علمی
اصطلاحات سے معرا سلاست و روانی سے مملو اور
دلچسپ و مفید ہے۔ طلباء نباتات جس مسئلہ کو انگریزی میں
نہ سمجھ سکیں وہ اس رسالہ میں مطالعہ کریں قیمت مجلد عہ کلدار

دیباچہ صحت۔ اس کتاب میں مطالبات صحت مثلاً ہوا،
پانی، غذا، لباس، مکان وغیرہ مبسوط اور دلچسپ بحث
کی گئی ہے۔ زبان عام فہم اور پیرایہ مؤثر و دل پذیر ہے۔
ملک کی بہترین تصنیف ہے اس کا مطالعہ کئی ہزار نسخوں سے
زیادہ قیمتی ثابت ہوگا۔ حجم ایک ہزار صفحے قیمت مجلد للعہ ر

قواعد اُردو۔ ارباب فن کا اتفاق ہے۔ کہ اُردو زبان
میں اس سے بہتر قواعد نہیں لکھے گئے۔ بسط و شرح کے علاوہ
اس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ فارسی قواعد کا تتبع نہیں کیا
گیا ہے قیمت عـ۶ ر کلدار

نکات الشعرا۔ یہ اُردو کا تذکرہ استاد الشعرا میر تقی مرحوم
کی تالیف سے ہے۔ اس میں بعض ایسے شعرا کے حالات
بھی ملیں گے جو عام طور پر معروف نہیں نیز میر صاحب
کی رائیں اور زبان کے بعض بعض نکات پڑھنے کے قابل
ہیں۔ مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدر الصدور
امور مذہبی سرکار عالی نے اس پر ایک ناقدانہ اور
دلچسپ مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت مجلد عـہ کلدار

فلسفۂ جذبات۔ کتاب کا مصنف ہندوستان کا
مشہور نفسی ہے۔ جذبات کے علاوہ نفس کی ہر ایک کیفیت
پر نہایت لیاقت اور زبان آوری کے ساتھ بحث کی گئی
ہے متعلمان نفسیات اسے نہایت مفید پائیں گے۔ مجلد
عـہ کلدار غیر مجلد عـہ کلدار

وضع اصطلاحات۔ یہ کتاب ملک کے نامور انشا پرداز
اور عالم مولوی وحید الدین سلیم (پروفیسر عثمانیہ کالج) نے
سالہا سال کے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد تالیف کی ہے
بقول فاضل مؤلف "یہ بالکل نیا موضوع ہے۔ میرے علم میں
شاید کوئی ایسی کتاب نہ آج تک یورپ کی کسی زبان میں
لکھی گئی ہے نہ ایشیا کی کسی زبان میں" اس میں وضع اصطلاحات
کے ہر پہلو پر تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور اسکے اصول
قائم کیے گئے ہیں۔ مخالف موافق رایوں کی تنقید کی گئی ہے
اور زبان کی ساخت اور اس کے عناصر ترکیبی مفرد و مرکب
اصطلاحات کے طریقے سابقوں اور لاحقوں اُردو مصادر کے
مشتقات غرض سینکڑوں دلچسپ اور علمی بحثیں زبان کے متعلق
آگئی ہیں" اُردو میں بعض اور بھی ایسی کتابیں ہیں جنکی نسبت یہ

کہا جا سکتا ہے کہ زبان میں اُن کی نظیر نہیں۔ لیکن اس کتاب نے زبان کی جڑیں مضبوط کر دی ہیں اور ہمارے حوصلہ بلند کر دیئے ہیں۔ اس سے پہلے ہم اُردو کو علمی زبان کہتے ہوئے جھجکتے اور اس کی آیندہ ترقی کے متعلق دعویٰ کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے مگر اس کتاب کے ہوتے یہ اندیشہ نہیں رہا۔ اس نے حقیقت کا ایک باب ہماری آنکھوں کے سامنے کھول دیا ہے۔ تعداد صفحات ۵۰۰ قیمت مجلد ۱۲ کلدار

نفح الطیب۔ یہ کتاب اسلامی عہد کی تاریخ اسپین کے معلومات کا خزانہ ہے۔ خلافت اسپین کے ہر مورخ کو اس کی خوشہ چینی کرنی پڑی ہے۔ علامہ مقریزی کی نامور اور مشہور آفاق کتاب ہے جو پہلی دفعہ اُردو میں ترجمہ ہوئی ہے۔ یہ کتاب عثمانیہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی داخل ہے صفحات ۴۰۰ قیمت مجلد (سے) کلدار

محاسنِ کلامِ غالب۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا معرکۃ الآرا مضمون ہے۔ اُردو زبان میں یہ پہلی تحریر ہے جو اس شان کی لکھی گئی ہے یہ مضمون اُردو کے پہلے نمبر میں طبع ہوا تھا صاحب نظر قدردانوں کے اصرار سے الگ طبع کیا گیا ہے۔ غیر مجلد قیمت ۱۲ کلدار

دیوانِ غالب جدید و قدیم۔ یہ وہ نایاب کلام ہے جس کی اشاعت کا اہل ملک کو بیحد انتظار تھا اس میں مرزا غالب کا قدیم و جدید تمام کلام موجود ہے۔ پیر صاحب کو قدیم کلام ملنے کی کیسے توقع تھی۔ یہ محض حسن اتفاق تھا کہ ہاتھ آگیا اور اب ریاست بھوپال سرپرستی میں چھپ کر شایع ہوا ہے۔ معہ مقدمۂ ڈاکٹر عبدالرحمٰن غیر مجلد للعہ مجلد صہ کلدار۔

(بلا مقدمہ غیر مجلد عہ کلدار مجلد ۱۲ کلدار)

مللِ قدیمہ۔ ایک فرانسیسی کتاب کا ترجمہ ہے جس میں بعض قدیم اقوام سلطنت کلدانی آشوری بابل بنی اسرائیل و فینیقیہ کی معاشرت عقاید صنعت و حرفت وغیرہ کے حالات دلچسپی اور خوبی کے ساتھ دیئے ہیں۔ اُردو میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے ان قدیم اقوام کے حالات صحیح طور سے معلوم ہو سکیں اس لیے انجمن نے اسے خاص طور پر طبع کرایا ہے۔ حالات کی وضاحت کے جا بجا تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ صفحہ ۴۰۰ قیمت ۱۲ کلدار

بجلی کے کرشمے۔ یہ کتاب مولوی محمد معشوق حسین خاں صاحب بی اے نے مختلف انگریزی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی ہے۔ برقیات پر یہ ابتدائی کتاب ہے اور سہل زبان میں لکھی ہے۔ ہمارے بہت سے ہموطن یہ نہیں جانتے کہ بجلی کیا چیز ہے کہاں سے آتی ہے کیا کام آسکتی ہے یہ کتاب ان تمام معلومات کو بتاتی ہے۔ لڑکوں کے لیے بھی مفید ہے۔ مجلد قیمت ۱۲ کلدار

اُردو

۱- انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر کے پہلے ہفتے میں شائع ہوا کریگا۔

۲- یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوں، حجم کم سے کم ۱۵۰ اور زیادہ سے زیادہ ۲۰۰ صفحے ہوگا۔

۳- قیمت ۱۲/ سالانہ مع محصول ڈاک اور ارکانِ انجمن ترقی اُردو سے ۱۲/ ملے

۴- تمام خط وکتابت :- آنریری سکرٹری انجمن ترقی اُردو و اڈیٹر اُردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہیئے۔

(باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپا اور دفتر سے شائع ہوا)